قصہ طلب

ضرب الامثال

از

خواجہ محمد عبدالمجید دہلوی

مکتبہ جامعہ دہلی

بار اول ایک ہزار

قیمت

تمہید

دہلی کے ریڈیو اسٹیشن نے مجھ سے یہ درخواست کی تھی کہ میں ایسے ضرب الامثال پر وہاں تقریر کروں جو قصہ طلب ہوں اور جن کا مفہوم بغیر قصہ کے بیان ہوئے کماحقہٗ نہ سمجھ میں آتا ہو۔ اس فریضہ کو انجام دینے کی غرض سے میں نے ایک بڑی تعداد ایسے امثال کی فراہم کر لی۔ چونکہ چند وجوہ سے میں یہ کام ریڈیو پر انجام نہ دے سکا۔ مناسب یہ معلوم ہوا کہ ان کو ایک کتاب کی صورت میں شائع کر دوں۔ یہ بھی امر پیش نظر تھا کہ اب تک ایسی کوئی کتاب اُردو زبان میں موجود نہیں ہے۔ اور یہ کہانیاں مفقود ہوتی جاتی ہیں۔ شاید اس ذریعہ سے ان لطیف قصص کو چندے ثبات نصیب ہو جائے۔ فقط

۲۶ رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ

احقر العبید
خواجہ محمد عبدالمجید

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضربُ الامثال قصّہ طلب

الف ۱

اندھیر نگری چوپٹ راجہ ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا

ایک گرو تھا اور ایک اُس کا چیلا۔ دونوں کا گذر ایک شہر میں سے ہوا۔ بھوک لگی تو کھانے پینے کی چیزوں کی قیمت دکانداروں سے دریافت کی معلوم ہوا کہ یہاں ہر چیز کا ایک نرخ ہے۔ جس بھاؤ بھاجی بکتی ہے اُسی بھاؤ کھاجا۔ آپ سمجھے کھاجا کیا چیز ہے۔ یہ پوربی زبان کا لفظ ہے۔ پورب میں اس مٹھائی کو کھاجا کہتے ہیں جس کا دہلی والوں نے گھمن بڑا نام رکھ چھوڑا ہے۔ یہ بڑی مزےدار مٹھائی ہے اور قیمتی بھی ہے۔ چیلے جی نے جب یہ دیکھا کہ اس

شہر میں مکھن بڑے دو پیسے سیر بکتے ہیں تو منہ میں پانی بھر آیا اور رال ٹپکنے لگی۔ بولے گرو جی ہم تو یہیں کے ہو لئے۔ گرو جی نے کہا اُرے کمبخت میرے ساتھ یہاں سے نکل چل، نہیں تو دیکھ کسی دن پیٹ کی بھینٹ چڑھ جائے گا اور جان کھو بیٹھے گا۔ یہ بیوقوفوں کی نگری ہے۔ یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔" مگر چیلے جی نہ ٹلنے تھے نہ ٹلے۔ گرو جی نے کہا خیر رہ۔ میں ایک انگوٹھی دے جاتا ہوں جب کوئی برا وقت پڑے انگلی سے اُتار کر منہ میں ڈال لیجو، میں آن کی آن میں آن موجود ہوں گا۔" پالاگوں کے بعد گرو جی رخصت ہو گئے اور چیلے جی ان کو شہر کے دروازہ تک چھوڑ آئے۔

کچھ دن چیلے جی مزے کرتے رہے۔ خوب سستے سستے کھاجے کھائے اور پیٹ پھلایا۔ اچھے خاصے بھینسا سور ہو گئے ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے، چیلے جی بازار میں تھے وہاں دیوار چنی جا رہی تھی۔ یہ سیر دیکھنے کھڑے ہو گئے۔ اور کچھ بات چیت کرنے لگے۔ اتنے میں دیوار دھڑام سے آن پڑی اور مزدور دب کر رہ گیا۔ راجہ جی کے سامنے مقدمہ پیش ہوا مالک

دیوار کو طلب کیا گیا۔ اُس نے یہ عذر پیش کیا۔ کہ "اس میں میں بے قصور ہوں۔ سارا قصور راج کا ہے جس نے دیوار بُری چنی۔" راج طلب ہوا۔ عرض کیا: "میں بالکل بے گناہ ہوں۔ ساری خطا مزدور کی ہے۔ اس نے گارا پتلا دیا تھا۔ میں کیا کرتا؟" مزدور بلایا گیا۔ ہاتھ باندھ کر عرض کی "اَن داتا! مجھ غریب کی کوئی خطا نہیں، سقہ نے گارے میں پانی زیادہ کر دیا۔" سقّے کی طلبی ہوئی۔ اس نے اپنی بے گناہی یوں ظاہر کی۔ "میں مشک سے پانی ڈال رہا تھا۔ اُدھر سے چیلے جی آ رہے تھے۔ وہ ایک چھکڑے سے بچے میری مشک کو دھکا لگا۔ مشک کا دہانہ کھل گیا۔ پانی ایک دم نکل پڑا۔ گارا پتلا ہو گیا۔" اب چیلے جی کی باری آئی۔ قصور سارا ان پر تھپا۔ اور پھانسی کا حکم صادر ہوا۔ چیلے جی کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی اور آئے اوسان جاتے رہے۔ سونچا کہ لو بھائی پیٹ کی بھینٹ چڑھے۔ خدا نے یہ خیر کی کہ اتنے میں گرو جی کی انگوٹھی یاد آ گئی جھٹ انگلی سے اُتار منہ میں رکھ لی۔ پل کی پل میں گرو جی آن کھڑے ہوئے۔ پھانسی تیار تھی۔ راجہ جی بیٹھے

ہوئے تھے۔ گروجی نے آتے ہی راجہ جی کو اسیس باد دی۔ اور کہا۔ یہ میرا چیلا ہے۔ مجھکو اس سے بہت محبت ہے۔ اس کے بدلے مجھے پھانسی دیدی جائے"۔ راجہ جی راضی ہو گئے وہاں تو جان کے بدلے جان لینی تھی اس سے مطلب نہ تھا کہ کس کی ہے۔ پھر کہا "مجھے تھوڑی دیر مہلت دی جائے میں پلوجا پاٹ کرلوں اور سبھ گھڑی دیکھ لوں"۔ راجہ جی نے اجازت دیدی۔ دم کے دم میں گروجی ہنستے ہوئے آن موجود ہوئے اور کہنے لگے "مجھے جلدی پھانسی پر چڑہاؤ۔ دیکھو دیر نہ ہونے پائے۔ راجہ جی حیران رہ گئے۔ پوچھنے لگے ایسی کیا مارا مار ہے اور تم کیوں خوش خوش معلوم ہوتے ہو"۔ بولے "ان داتا بات کرنے کا موقع نہیں سبھ گھڑی نکل جائے گی۔ مجھے اپنے گیان سے معلوم ہو گیا ہے کہ جو اس پل مرے گا وہ سیدھا بیکنٹھ کو جائیگا بس اب جلدی کیجئے۔ وقت ہاتھ سے نہ جاتا رہے" یہ سنتے ہی راجہ جی لپکے اور پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈال بیکنٹھ باشی ہو گئے۔

گروجی اور چیلے جی رام کی دیا سے صحیح سلامت رہے۔ اور
اس شہر سے نکل گئے۔

(۲) اس میں کچھ ہے (۲)

ایک صاحب اپنے کسی دوست کی ملاقات کی غرض سے
اس کے شہر گئے۔ ریل سے اتر کر اپنا سامان مزدور کے سر پر
رکھا اور دوست کے گھر روانہ ہوئے۔ مزدور نے دریافت
کیا کہ مجھے کیا ملے گا۔ کہنے لگے کچھ دیدیں گے۔ مزدور پیچھے
پیچھے اور یہ آگے آگے گھر پر جا پہنچے۔ صاحبِ خانہ نے بہت
تپاک سے مہمان کا استقبال کیا۔ مزدور نے اسباب اُتار کر رکھ
دیا اور اُجرت طلب کی۔ یہ اس کو دو چار پیسے دینے لگے۔ مگر وہ
راضی نہیں ہوا۔ کچھ اور اضافہ کیا، پھر بھی وہ انکار ہی کرتا رہا اور یہ
کہتا جاتا تھا کہ میں تو "کچھ" لوں گا۔ اسی وعدہ پر آیا ہوں۔ آپس میں
تکرار ہونے لگی۔ لوگ گلی میں اکٹھے ہو گئے۔ ایک صاحب نے
آگے بڑھ کر ماجرا دریافت کیا۔ اُن کے آگے سارا قصہ دہرایا گیا۔

وہ سن کر چپ ہو رہے۔ کہنے لگے "بھائی بیٹھ جا دم لے یہ صاحب ابھی سفر سے آئے ہیں۔ ذرا کھا پی لیں اور سستا لیں تو میں تیرا فیصلہ کرا دوں گا۔" اتنے میں کھانا آگیا اور سب کھانے میں مشغول ہوئے۔ صاحب خانہ نے نوکر سے کہا۔ "بھائی ایک پیسہ کا دہی تو بازار سے لے آؤ" یہ صاحب بولے "پیسہ مجھے دیجئے۔ میں دہی لائے دیتا ہوں" پیالی ہاتھ میں لے دہی لینے چلے گئے۔ دہی میں ایک ذرا سا کوئلے کا ٹکڑا ڈال دیا۔ مزدور سامنے بیٹھا تھا۔ دہی اس کو دکھا کر پوچھنے لگے "بھائی دیکھو اس میں کیا پڑا ہوا ہے" اس نے دیکھ کر کہا "اس میں "کچھ" پڑا ہوا ہے" انھوں نے دہی پتے پر نکال اس کے حوالے کیا اور کہا "لے بھائی اپنا "کچھ" لے جا" وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اور بولا حضور یہ تو بتائیں آپ کون ہیں ضرور کشمیری ہیں" وہ بولے "بھائی تو بھی تو کشمیری ہے" بولا "ہاں ٹھیک ہے بھائی ہی بھائی کا گلا کاٹا کرتا ہے۔ یہ چال کسی اور کو نہ سوجھتی۔

---

(۳) ایک گھسّے پر ہزار روپیہ قربان (۳)

ایک امیر صاحب مع اپنے لاؤ لشکر کے سفر کر رہے تھے راستہ میں ایک ندی پڑی۔ اس میں چڑھاؤ آیا ہوا تھا۔ اور کشتی لگ رہی تھی۔ یہ اور ان کے ہمراہی مع سازو سامان کے کشتی پر سوار ہو گئے۔ اس میں اور بھی مسافر تھے۔ ان میں ایک شخص گنجہ تھا۔ بہت میلے کچیلے کپڑے پہنے بیٹھا تھا۔ اور اس کا گنج پکنا تھا بار بار اپنے سر سے ٹوپی اُتارتا اور بہت بری طرح دونوں ہاتھوں سے سر کو نوچتا۔ امیر صاحب کو یہ دیکھکر بہت گھن آئی۔ فرمایا "اگر بھائی تو کشتی کے پار لگنے تک سر نہ کھجائے تو پار جاکر میں تجھے ایک ہزار روپیہ دوں گا"۔ گنجہ بیچارہ غریب آدمی تھا ہزار روپے کا نام سن کر خوش ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے ٹوپی کو اپنے سر پر جمالیا۔ ہاتھ بغلوں میں دبا کر ہو بیٹھا۔ بہت دیر تک یہی حالت قائم رہی۔ مگر جب کشتی کنارے سے تھوڑی دور رہ گئی، اس سے صبر نہ ہو سکا۔ ٹوپی اُتار کر تو گود میں رکھ لی

اور دونوں ہاتھوں سے اس زور سے سر کو کھجایا کہ دیکھنے والے بھی عش عش کرنے لگے۔ یہ کہتا جاتا تھا اور گھستا لگاتا جاتا تھا کہ "ایک گھستے پر ہزار روپیہ قربان ہیں"۔

(۴) اونٹ کے گلے میں بلّی (۴)

ایک آدمی کو اپنے اونٹ کی شرارت پر بہت غصّہ آیا اور قسم کھا بیٹھا کہ حرامزادے میں تجھکو دس روپے بدل بیچڈالوں گا۔ جب قسم پوری کرنے کا ارادہ کیا۔ تو دل میں بہت پشیمان ہوا۔ اگر قسم پوری نہیں کرتا ہوں تو کیا تعجب ہے کہ خدا کے غضب میں مبتلا ہو جاؤں۔ جو پوری کرتا ہوں تو سخت مالی نقصان ہے۔ ایک تدبیر اس کی سمجھ میں آئی۔ اس نے یہ کیا کہ ایک بلّی پکڑی اور اسی سے باندھ اونٹ کے گلے میں لٹکادی۔ بازار میں اونٹ کا سودا کرنے چلا۔ جو کوئی اونٹ کی قیمت دریافت کرتا اس سے کہتا کہ اونٹ دس روپے میں ہے، اور بلّی سو روپے کو ان دونوں کا سودا ساتھ ہوگا۔ اس طرح اونٹ کی قیمت پوری وصول ہوگئی۔ اور اپنے خیال

میں قسم کے توڑنے کے عذاب میں بھی مبتلا نہیں ہوا۔ بھائیو! دیکھو کہیں ایسا نہ کر بیٹھنا۔ کہ آدمیوں کو دھوکا دیتے دیتے، خدا کو بھی دھوکا دے بیٹھو۔ وہ دھوکے میں آنے والی اسامی نہیں۔

(۵) آپ بیتی کہوں یا جگ بیتی (۵)

کہانی صبر بادشاہ زادہ

ایک بادشاہ تھا۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ خدا کا بنایا رسول بادشاہ۔ اس کی چار بیٹیاں تھیں۔ دل میں یہ خیال سمایا کہ ان سب کا عیش و آرام میرے دم سے ہے۔ ایک ایک بیٹی کے پاس گیا اور اپنے اس خیال کو سنا کر اپنی تعریف اور توصیف کا خواہاں ہوا۔ ہر بیٹی نے بیحد تعریف کی اور شکر گزاری کا اظہار کیا۔ مگر جب سب سے چھوٹی لڑکی کے پاس آیا تو اس نے اس سے دل خوش کن باتیں نہیں بنائیں بلکہ کہا کہ اس میں آپ کی کوئی مہربانی نہیں ہے۔ راحت و مصیبت تنگی اور فراخی سب خدا

کے ہاتھ ہے۔ یہ سن کر بادشاہ کو غصّہ آگیا۔ اُس کو ڈولے میں سوار کرا دو ایک دن کا کھانا پانی رکھوا، حکم دیا کہ کہیں جنگل میں ڈولا رکھ آو۔ دیکھیں تو خدا اس کی کس طرح مدد کرتا ہے۔ ڈولا جنگل میں رکھ دیا گیا۔ نوکر چاکر سب اس کو چھوڑ چلے آئے۔ شاہزادی کو خدا پر پورا بھروسہ تھا۔ چپ چاپ بیٹھی رہی اور رویا کی اور دعائیں مانگا کی۔

جب رات سن سان ہو گئی اور چاروں طرف سے اندھیرا چھا گیا۔ تو اُس کو ڈر لگنے لگا۔ دور سے ایک طرف روشنی نظر آئی۔ اس نے سونچا وہاں ضرور کوئی رہتا ہوگا۔ اس طرف چلی۔ وہ ایک فقیر کی جھونپڑی تھی۔ کہا "بابا صاحب میں ایک مصیبت زدہ لڑکی ہوں۔ آپ مجھے اپنے پاس رکھ لیجے" فقیر کیا دیکھتا ہے کہ ایک نازک نازنین نازوں کی پالی لڑکی سامنے کھڑی ہے اور التجا کر رہی ہے۔ وہ لاولد تھا۔ دل بھر آیا۔ کہا "بیٹی بیٹھ جاؤ۔ تو میری بیٹی میں تیرا باپ" رات اسی جھونپڑی میں گزاری۔ صبح ہوئی تو پھر اپنے ڈولے میں جا بیٹھی۔ خالی بیٹھے بیٹھے جی گھبرانے لگا۔ جنگل میں سے ایک لکڑی لے، زمین کریدنے

لگی۔ ذرا سی دیر ہی کریدا تھا کہ ایک پتھر کی سل نمودار ہوئی۔ اس
میں لوہے کا کڑا لگا ہوا تھا۔ کڑے کو پکڑ کر سل کو اُٹھایا تو دیکھتی
کیا ہے کہ اندر زر و جواہر کا خزانہ ہے۔ اُسی طرح سل ڈہانک
اوپر سے مٹی ڈال دی اور دوڑی دوڑی فقیر کے پاس گئی۔
اس سے سارا ماجرا کہا۔ ساتھ لاکر یہ خزانہ دکھایا۔ دونوں نے
مل کر زر و جواہر کو ڈھویا اور جھونپڑی میں گڑھا کھود کر دبا دیا۔ اب
لڑکی نے کہا:۔ ابا جی تم شہر میں جاؤ اور اچھے اچھے راج مزدور
بلا لاؤ۔ میں اپنے لئے یہاں محل چنواؤں گی"۔ راج مزدور حاضر
ہو گئے۔ نقشہ وہی تجویز ہوا۔ جو بادشاہ سلامت کے محل کا تھا۔
چند روز میں عالی شان عمارت بن کر تیار ہو گئی۔ باغ باغیچہ سب کچھ
لگ گیا۔ نوکر چاکر حاضر ہو گئے۔ اور جنگل میں منگل ہونے لگا۔ بادشاہ
کو بھی اس کی خبر پہنچی۔ مگر اُس نے کچھ توجہ نہیں کی۔ تھوڑے دنوں
بعد بادشاہ کا ارادہ سفر کا ہوا۔ سب بیٹیوں سے پوچھا کہ تمھاری
کیا فرمائش ہے۔ اس لڑکی کا بھی خیال آیا۔ اور کہا اُس کمبخت
سے بھی جا کر پوچھ آؤ۔ کہ اس کے واسطے کیا لائیں"۔ جب

شاہی خادمہ اس کے پاس آئی تو وہ نماز میں مشغول تھی۔ سلام پھیر کر اشارے سے کہا صبر کر۔ مگر وہ تو تیکھا تھی۔ اور یہ بھی جانتی تھی کہ بادشاہ شاہزادی سے ناراض ہیں۔ وہاں جا کر یہ عرض کیا کہ "شاہزادی صاحبہ صبر کی فرمائش کرتی ہیں"۔ جب لڑکی نماز سے فارغ ہوئی تو اس عورت کو نہ پایا۔ چپ ہو رہی۔ بادشاہ سیاحت کو روانہ ہو گئے۔ غیر ملکوں میں جا کر سب شاہزادیوں کی فرمائش فراہم کی اور اس لڑکی کے واسطے یہ نئی قسم کی فرمائش تلاش کرنے کا حکم دیا۔ نوکر جا کر گلی کوچوں میں آواز لگاتے پھرے کہ "کہیں صبر بکتا ہو تو ہمارا بادشاہ خریدار ہے"! ایک گھر میں سے بڑھیا نکلی اور زرنگار پنکھا ان کو دیدیا۔ اور کہا "یہ صبر ہے۔ اس کو لیجاؤ اور ایک لاکھ روپیہ قیمت کا مجھے دے جاؤ"! بادشاہ سلامت بخیر و خوبی اپنے شہر میں واپس آ گئے۔ سب کو سوغات بٹی۔ پنکھا شاہزادی کے پاس بھیجدیا گیا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ کہنے لگی "باوا جان جو پنکھا لائے ہیں اس کو میرے پلنگ کے سرہانے رکھدو"۔ رات کو گرمی لگی تو پنکھا اٹھا کر جھلنے لگی۔ فوراً ایک

شاہزادہ چندے آفتاب چندے مہتاب آن کھڑا ہوا۔ یہ دوشیزہ
شرما گئی اور منہ کپڑے سے ڈھانک لیا۔ چاہتی تھی کہ چیخ مارے
مگر شاہزادہ نے منہ پر ہاتھ رکھدیا اور کہا "میں تو تمھارا بلایا ہوا آیا
ہوں"۔ وہ بولی "میں نے کب بلایا تھا؟" کہنے لگا "میں صبر بادشاہ زادہ
ہوں اور اس پنکھے کا تابع۔ پنکھا ہلاتے ہی چلا آتا ہوں"۔ اب
شاہزادی نے جو اس کو دیکھا تو اس پر ایک جان سے نہیں بلکہ
ہزار جان سے عاشق ہو گئی۔ ان دونوں نے چوسر پچیسی کھیل کر
ساری رات گزاری۔ صبح ہوتے ہی شاہزادہ نے کہا "پنکھا اُلٹا
ہلادو۔ میں اپنے گھر چلا جاؤں گا"۔ جب شدہ شدہ یہ خبر محلوں تک
پہنچی کہ شاہزادی کا نکاح ایک نہایت خوبصورت شاہزادہ
سے ہو گیا ہے تو بہنوں کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑکی۔ بادشاہ
سے اجازت لے کر اور یہ بہانہ کر کے کہ ہمارا دل اپنی بہن سے
ملنے کو بہت چاہتا ہے اس کے پاس آگئیں۔ شاہزادی نے ان
کی آؤ بھگت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ انھوں نے اس کے
شاہزادہ کی بیحد تعریف کی اور کہا ہمارا جی یہ چاہتا ہے کہ ہم

اپنے ہاتھ سے آج اپنی بہن کے واسطے سیج بچھائیں۔ یہ بیچاری بھولی بھالی اس جُل میں آگئی۔ شاہزادیاں اپنے ساتھ پسا ہوا شیشہ لائیں تھیں وہ پلنگ پر بکھیر دیا۔ شام ہوتے ہی یہ سب سوار ہوگئیں۔

رات کو جب شاہزادہ پلنگ پر لیٹا تو اس کے نازک بدن میں سارے شیشے چبھ گئے بے چین ہوگیا۔ کہنے لگا جلدی پنکھا اُلٹا پھیرو۔ یہ بھی گھبراگئی اور پریشانی کے عالم میں پنکھا پھیر دیا۔ وہ اسی وقت غائب ہوگیا۔ اب لاکھ پنکھا ہلاتی ہے مگر شاہزادہ کسی عنوان نہیں آتا۔ دل ہی دل میں گھٹنے اور کڑھنے لگی۔ جب دن زیادہ گزر گئے تو شاہزادہ کی تلاش میں نکلنے کی ٹھان لی اور جوگیا بھیس بنا بھبوت مل، دوتارا ہاتھ میں لے گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ چلتے چلتے آدھی رات اِدھر آدھی رات اُدھر سوئے سارا سنسار جاگے پاک پروردگار، ایک درخت کے نیچے پہنچی۔ درخت کے اوپر چکوا چکوی کا جوڑا بیٹھا تھا۔ چکوی نے کہا "میاں چکوے کچھ باتیں کرو کہ رات کٹے"،

چکوا بولا: "آپ بیتی کہوں یا جگ بیتی۔ بولی" آپ بیتی تو روز ہی سنتے ہیں۔
آج کچھ جگ بیتی سناؤ" بولا کہ "ہمارے شہر کے بادشاہ کا لڑکا جو
صبر بادشاہ زادہ ہے بہت بیمار ہے۔ پھر ساری صبر بادشاہ زادہ
کی کہانی کہہ سنائی۔ چکوی بولی آخر اس کی کوئی دوا بھی ہے۔ چکوا بولا
"اگر اس کا کوئی رفیق اس دم یہاں موجود ہو اور ہماری بیٹ سمیٹ
لے۔ بس یہی اس کا علاج ہے۔" شاہزادی نے یہ ساری باتیں سنیں
صبح ساری بیٹ جمع کر جھولی میں بھر شہر کی طرف روانہ ہوئی۔ اور
بید حکیم کا روپ بھر شہر میں داخل ہوگئی۔ شاہی محل کے نیچے بید حکیم
بید حکیم کی آواز لگانی شروع کی۔ یہاں بادشاہ شاہزادہ کا علاج کرتے
کرتے عاجز آگیا تھا۔ حکم دیا کہ اس بید حکیم کو بلا لاؤ۔ شاید اسی کے ہاتھ
پر شفا لکھی ہو۔ بید حکیم حاضر ہوا۔ مریض کے بستر پاس لایا گیا اور معالجہ
شروع ہوگیا۔ سب کو کمرہ میں سے باہر کر دیا۔ بیٹ ایک پیالے
میں گھول کر اس کے سارے بدن پر تھوپ دی۔ شاہزادہ کے
زخم منٹوں میں دیکھتے دیکھتے بھرتے چلے آئے۔ چند روز میں پوری
صحت ہوگئی اور بدن کندن سا نکل آیا۔ شہر میں شادیانے بجنے لگے

بادشاہ نے بید حکیم کو دربار میں طلب کیا اور انعام اکرام دینے کا ارادہ کیا مگر وہ کسی چیز کے لینے پر راضی نہیں ہوئی۔ یہ کہا میں جو مانگوں وہ پاؤں۔" بادشاہ نے کہا۔"مانگ کیا مانگتا ہے"۔ کہا شاہزادہ کے ہاتھ کی انگوٹھی، اس کی تلوار اور دوشالہ میں مانگتا ہوں"۔ فوراً حاضر کیا گیا۔ بید حکیم یہ لیکر رخصت ہو گیا۔

گھر میں پہنچکر رات کو پھر پنکھا ہلایا۔ شاہزادہ آن موجود ہوا۔ مگر غصہ میں بھرا ہوا تھا۔ اپنی ساری حقیقت اس سے کہی۔ اُس نے اپنی بہنوں کی بدمعاشی اور چالبازی کا حال سنایا۔ تب وہ کچھ ٹھنڈا پڑا۔ پھر اس نے کہا تمھیں کچھ خبر بھی ہے کہ وہ بید حکیم کون تھا جس نے تم کو اچھا کیا۔" کہنے لگا۔"میں کیا جانوں"۔ اس نے کہا"وہ میں ہی تو تھی اور اس کے ہاتھ کی انگوٹھی اور تلوار اور دوشالہ سامنے رکھدیا اب تو شاہزادے کی آنکھیں کھلیں۔ اس کا سارا غصہ محبت میں مبدل ہو گیا۔ اس نے بھی اپنی ساری داستان اور مصیبت کا حال کہہ سنایا جیسے ان دونوں کے دن پھرے۔ اسی طرح خدا کہنے سننے والوں کے دن پھرے۔

٦ اُس اُس میری کان میں گھسے ٦

ایک پودنا تھا اور ایک پودنی۔ دونوں ایک درخت پر
بیٹھے تھے۔ راجہ جی شکار کو نکلے۔ پودنی عورت ذات تھی جال
میں پھنس گئی۔ پودنا دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ پودنی کو لے راجہ جی
چل دئے۔ پودنے کو بڑا رنج ہوا۔ اس نے سرکنڈے کی ایک
گاڑی بنائی دو مینڈک جوتے اور راجہ جی کے ہاں سے پودنی
چھڑالانے کے ارادہ سے چل پڑا۔ یہ کہتا جاتا تھا۔ دو سرکنڈوں
کی آڑی گاڑی دو مینڈک جوتے جائیں۔ راجہ ماری پودنی ہم بیر
بسانے جائیں۔ راستہ میں سامنے سے ایک شیر آ رہا تھا۔ کہنے لگا
میاں شیر دو سرکنڈوں کی آڑی گاڑی دو مینڈک جوتے جائیں راجہ
ماری پودنی ہم بیر بسانے جائیں۔ چلو بھائی تم بھی میرے ساتھ چلو
اُس اُس میرے کان میں گھس۔ شیر کو کان میں بٹھالیا۔ اور آگے چلا
تو سامنے سے دریا نظر آیا اُس سے کہا دو سرکنڈوں کی آڑی گاڑی
دو مینڈک جوتے جائیں۔ راجہ ماری پودنی ہم بیر بسانے جائیں۔

بھائی دریا تو بھی بیر بسانے ہمارے ساتھ ہوئے پھر کہا اُس اُس میرے کان میں گھس۔" وہ بھی کان میں گھس گیا۔ آگے چلے تو بی چیونٹی رینگتی چلی جا رہی تھیں۔ اُس سے بھی یہی کہا اور کان میں دھر لیا۔ بس اب سب کو ساتھ لے راجہ کی نگری میں جا پہنچا اور ایک ایک چیز کو آہستہ آہستہ چھوڑنا شروع کیا۔ راجہ جی کو خوب پریشان کیا۔

یہاں کا قصہ یہاں چھوڑیئے اور بی پودنی کا حال سنئے۔ راجہ نے اُس کو مار کر پکوانے کے لئے باورچی خانہ میں بھیجا۔ جب پتیلی میں ڈالی گئی تو بولی "اہو ہم پتیلی میں پڑے اوہو ہم پتیلی میں پڑے۔" پھر اوپر سے مرچیں پڑیں تو اندر سے آواز آئی "اوہو میں نے لال جوڑا پہنا اوہو میں نے لال جوڑا پہنا۔" جب ہلدی ڈالی تو بولی "اوہو میں نے زرد جوڑا پہنا اوہو میں نے زرد جوڑا پہنا۔" جب دھنیا ڈالا تو بولی "اوہو میں نے دھانی جوڑا پہنا۔ اوہو میں نے دھانی جوڑا پہنا۔" جب راجہ جی کو یہ خبر پہنچی تو کھاتے وقت بہت ہوشیار رہنے کا قصد کیا۔ اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ ننگی تلواریں لئے اس کے چاروں طرف کھڑے رہیں۔ اگر پودنی پیٹ میں سے نکل کر اڑ جانے کا ارادہ کرے

تو فوراً قتل کر دیں۔ راجہ جی نے پودنی کو کھایا۔ ان کو ایک چھینک آئی اور پودنی ناک میں سے باہر نکلنے لگی۔ فوراً تلوار کا وار ہوا۔ پودنی تو پھر سے اُڑ گئی۔ مگر راجہ جی کی ناک کٹ گئی۔ پھر یہ دونوں میاں بیوی اڑ کر چلے اور یہ کہتے جاتے تھے "راجہ جی کی ناک کٹائی اور پودنی صحیح سلامت آئی"

(۷) اور کیا بانس پر چڑھو گے

ایک نواب صاحب ہاتھی پر چڑھے چلے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک فقیر ملا۔ نواب صاحب نے ہاتھی رکوا لیا اور فقیر صاحب سے دعا کے طالب ہوئے۔ فقیر بولا "ہاتھی پر تو چڑھے جا رہے ہو اب اور کیا بانس پر چڑھو گے"

(۸) انگور کھٹے ہیں

ایک لومڑی انگور کی بیل کے نیچے آئی۔ بڑے بڑے خوشے لٹکتے ہوئے دیکھ کر بہت للچائی۔ چاہا کہ ایک آدھ خوشہ توڑ کر کھائے

اچھلی پھد کی مگر خوشوں تک نہ پہنچ سکی۔ جب عاجز آگئی تو اپنی شرمندگی مٹانے کے لئے یہ کہتی ہوئی چلدی کہ انگور تو کھٹے ہیں۔

(۹) اللہ میاں کے چھوٹے بھائی (۹)

ایک نواب صاحب دیوان خانہ میں مسند پر بیٹھے ہیں۔ اردگرد مصاحب اور شوربے چٹ جمع ہیں۔ باہر سے نوکر آکر یہ عرض کرتا ہے کہ ایک صاحب دروازہ پر کھڑے ہیں اور حضور سے ملاقات کرنی چاہتے ہیں۔ نواب صاحب نے کہا اُن کا نام کیا ہے نوکر نے جواب دیا حضور وہ اپنے کو اللہ میاں کا چھوٹا بھائی بتاتے ہیں۔ یہ سن کر سب حیران رہ گئے۔ اور ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا نواب صاحب نے فرمایا انھیں بلالو۔ سامنے سے جو آتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بڑے لحیم شحیم آدمی ہیں۔ کچھ تو اللہ میاں ہی نے موٹا تازہ بنایا ہے اور کچھ گدڑے چھتڑے لپیٹ کر اپنے کو ڈبل بنا رکھا ہے۔ ڈاڑھی بھی چھاج سی لٹک رہی ہے۔ معلوم نہیں اپنی ہے یا مانگے کی۔ سارے بدن پر یہاں تک کہ سر کی ٹوپی اور پاؤں کی

جوتی پر ساری دنیا کے پرندوں کے پر لپٹے ہوئے ہیں۔ چیل کوے کے پروں کو بھی نہیں بخشتا ہے۔ جب لبِ فرش تشریف لائے تو سب ان کی تعظیم کے لئے سروقد کھڑے ہو گئے اور نواب صاحب نے اپنے پہلو میں مسند پر ان کو جگہ دی۔ حقہ پان سے تواضع کرنے کے بعد استفسار حال کیا۔ فرمایا "میں اللہ میاں کا چھوٹا بھائی ہوں۔ اور مجھے کلّہ میاں کہتے ہیں"۔ نواب صاحب نے عرض کی "اپنی قدرت کا کوئی کرشمہ دکھایئے"۔ بولے "جو کہو"۔ اس محفل میں ایک صاحب یک چشم بھی بیٹھے تھے۔ نواب صاحب نے کہا "کیا اچھا ہو کہ آپ کی بدولت یہ دو آنکھیں والے ہو جائیں" فرمایا "بنانا تو بڑے بھائی صاحب کا کام ہے اور بگاڑنے کا کام میرے سپرد ہے۔ کہو تو ان کی دوسری آنکھ بھی ابھی پھوڑ دوں"۔ یہ سن کر بیچارا کانڑا لرزا اٹھا کہ ایک تو اللہ میاں نے لے لی ہے۔ دوسری کلّہ میاں کے نذر ہوتی ہے۔ مگر حاضرینِ محفل نے حضرت کو یہ کرشمہ دکھانے نہیں دیا۔ اور صحبت ختم ہو گئی۔

---

(۱۰) ایں ہم بر سرِ علم (۱۰)

یہ فارسی کی ضرب المثل ہے۔ عوام کی زبان پر نہیں۔ خواص بولتے ہیں۔ اس کا قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے۔ کسی مسجد میں مولوی صاحب وعظ فرما رہے تھے اور لوگوں کو خوب دوزخ کے منظر دکھا دکھا کر ڈرا رہے تھے۔ موضوع کلام خیانت اور بد دیانتی تھا۔ اثنائے وعظ میں درزیوں کی بد دیانتی کا ذکر آیا اور ان کی قطع و برید پر لعن طعن شروع کی۔ شاید کسی درزی کے زخم خوردہ تھے۔ پند و نصائح بڑے مؤثر پیرایہ میں فرماتے۔ مسجد کے کسی گوشہ میں ایک درزی بھی بیٹھا ہوا وعظ سن رہا تھا۔ ممکن ہے کہ روئے کلام اسی کی طرف ہو۔ بیان فرمایا کہ "روز محشر خدا کے دربار میں تمام درزی حاضر کئے جائیں گے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک بلند و بالا علم ہو گا۔ اور اس پر عمر بھر کے چرائے ہوئے۔ کپڑے حتیٰ کہ کترنیں تک آویزاں ہوں گی۔ اس طرح تمام مخلوق کے رو برو ان کی آبروریزی کی جائے گی"۔ درزی کے دل پر وعظ کا

بہت اثر ہوا۔ اسی وقت توبہ کی اور چندے توبہ پر قائم بھی رہا۔
مگر اس اثنا میں کوئی بیش قیمت کپڑا اُس کے پاس نہیں آیا۔ ایک
دن ایک امیر صاحب نے اُس کو بلا بھیجا اور کمخواب کا طاقہ حوالہ
کیا کہ چغہ تیار کرے۔ طاقہ بہت بیش قیمت تھا۔ درزی نے کتر
بیوت کرکے نواب صاحب کا اطمینان کر دیا۔ جب گھر آکر ناپ
تول کی تو پورا ایک نیمہ آستین کا ٹکڑا نکلتا تھا۔ نہ رہا گیا۔ بہت ضبط
کیا مگر دل نے نہ مانا۔ پرانی عادت عود کر آئی۔ ٹکڑا الگ اتار ہی لیا
اور کہنے لگا "ایں ہم بر سر علم" جہاں دوسرے ٹکڑے علم پر ہوں گے
ایک یہ بھی سہی۔

(۱۱) آپکی جوتیوں کا صدقہ ہے (۱۱)

ایک دن ایک صاحب کسی دوست سے ملاقات کرنے
کو ان کے گھر گئے۔ وہاں پہنچنا تھا کہ ابر اٹھا اور موسلا دھار بارش
شروع ہو گئی۔ جل تھل بھر گئے۔ مینہ یہ کہے کہ آج برس کے پھر
نہیں برسوں گا۔ گھر واپس آنا ناممکن ہو گیا۔ کھانے کا وقت آیا۔

میزبان کو ان کے کھانے کی فکر ہوئی۔ گھر میں جو پکا ہوا تھا وہ اس قابل نہ تھا کہ ان کے سامنے لایا جائے۔ یوں تو اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ مگر حضرت خسّت میں اپنے نام کے ایک ہی تھے۔ دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ مہمان پر کچھ خرچ کریں۔ مہمان بہت فوق البھڑک ٹاٹ بافی نئی جوتی پہنے ہوئے تھے۔ ان کو یہ تدبیر سوجھی کہ انھی کی جوتی کو بکوا کر ان کی دعوت کردی جائے۔ نوکر کو ایک طرف بلا کر کہا "بھائی ان کی جوتی لیجا اور بیچ کر ان کے کھانے کا سامان خرید لا" اس نے بازار میں جاکر جوتی کے کوڑے کرڈالے اور سامان لے آن موجود ہوا۔ دسترخوان بچھا اور انواع و اقسام کا کھانا حاضر کیا گیا۔ جب مہمان کھانے بیٹھے تو کہنے لگے کہ آپ نے اس قدر تکلف کیوں کیا" میزبان بولے "یہ سب کچھ آپ کی جوتیوں کا صدقہ ہے" بار بار وہ بھی کہتے تھے اور یہی جواب پاتے تھے۔ اتنے میں مینہ کھل گیا۔ گھر جانے کا ارادہ کیا اب جو دیکھتے ہیں تو جوتی ندارد۔ سمجھ گئے کہ چور تو یہاں کہاں۔ جناب ہی نے جوتیاں بیچکر کھانا کھلایا ہے۔ پہلے سے بھی اپنے دوست کی خسّت سے آگاہ تھے۔ ان سے

کھو نسٹرا مانگ کر گھر آ گئے۔ جب تک زندہ رہے ان کی اس حرکت پر رطب اللسان رہے۔

(ب) بھیگی بلّی بتانا (۱۲)

ایک صاحب کمرہ بند کئے رات کو بیٹھے ہوئے تھے۔ جاڑا سخت پڑ رہا تھا۔ اور مہاوٹ کا مینہہ برس رہا تھا۔ نوکر دوسرے کمرہ میں پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ان کو یہ خیال ہوا۔ کہ معلوم نہیں مینہہ تھما یا نہیں۔ شاید پھنیاں پھنیاں برس رہا ہو۔ نوکر کو آواز دیکر کہا۔ بھائی ذرا باہر نکل کر دیکھیو تو مینہہ بند ہوا یا نہیں؟ سردی کے مارے نوکر آپ ہی سکڑ رہا تھا۔ باہر نکلنے کو جی نہ چاہا۔ وہیں سے بیٹھے بیٹھے کہنے لگا۔ "میاں برس رہا ہے" بھائی تو تو باہر بھی نہیں گیا۔ یہ کیونکر سمجھ لیا کہ برس رہا ہے" بولا "میاں ابھی ابھی بھیگی ہوئی بلّی آئی تھی۔ مینہہ ضرور برس رہا ہے"

---
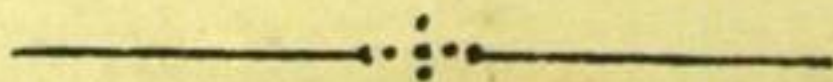
۱۴ بگلّے پکڑنے ۱۴

ایک صاحب یاروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں غپ شپ اُڑ رہی تھی۔ بولے "میاں ہم اگر بگلّے پکڑنے کی ترکیب بتا دیں تو کیا دلواؤ گے۔" یاروں نے کہا "ضرور بتاؤ مٹھائی کھلائیں گے۔" بولے "بگلّے صبح کے وقت دریا کے کنارے کھڑے دھوپ میں سکھا کرتے ہیں۔ تم تھوڑا سا موم لو اور منہ اندھیرے اُٹھ کر دریا کے کنارے چلے جاؤ۔ دبے دبے پاؤں جا کر ذرا سا موم بگلّے کے سر پر رکھ دو۔ جب آفتاب کی گرمی پہنچے گی تو موم پگھل کر اُس کی آنکھوں میں چلا جائے گا اور وہ اندھا ہو جائے گا۔ پھر تم جا کر پکڑ لینا۔" یار بولے "واہ بھائی اچھی بے پر کی اُڑائی۔ جب ہم موم رکھنے جائیں گے۔ تو بگلا پاؤں کی آہٹ پا کر اُڑ نہ جائے گا۔ تم بھی نِرے بودم ہی رہے"

باندھ رے موئے تو ہینگ کی پڑی میری بیٹی کاتے لوگڑی

۱۴

ایک بڑھیا تھی اور اس کی ایک لڑکی۔ لڑکی کی عمر زیادہ ہو گئی مگر غربت کی وجہ سے بر نہیں جڑتا تھا۔ بڑھیا کا جی چاہتا تھا کہ اسے کسی اچھے کھاتے پیتے گھر بیاہ دے۔ بکری کو اور بیٹی کو ہری گھانس پر چھوڑتے ہیں۔ بڑھیا ایک دن دمڑی کی ہینگ لینے بازار گئی۔ پنساری سے ہینگ مانگی۔ وہ ہینگ کی پڑیا باندھنے بیٹھا۔ یہ کہنے لگی۔ باندھ رے موئے تو ہینگ کی پڑی۔ میری بیٹی کاتے لوگڑی۔ مطلب یہ تھا کہ جتنی دیر میں تو ایک ہینگ کی پڑیا باندھتا ہے میری بیٹی اتنی ہی دیر میں تو سوت کی گگڑیاں کات لیتی ہے۔ یہ سن کر پنساری کے منھ میں پانی بھر آیا، اور سمجھا یہ لڑکی تو سونے کی چڑیا ہے۔ اگر گھر میں آگئی تو وارے نیارے ہیں۔ بڑھیا سے اس کے ساتھ نکاح کرنے کی بات چیت کی۔ بڑھیا راضی ہو گئی۔ اس طرح اس نے اپنی بیٹی کو ٹھکانے لگایا۔

(۱۵) بندر بانٹ (۱۵)

دو بلیاں کہیں سے ایک پنیر کا ٹکڑا چرا لائیں۔ ان دونوں میں اس کے بانٹنے پر تکرار ہوئی۔ وہاں ایک بندر تھا۔ اس کے پاس پاس آدھا آدھا کرنے کو لے گئیں۔ اُس نے ترازو ہاتھ میں لے پنیر کے دو ٹکڑے کر دونوں پلڑوں میں چڑھا دئے۔ مگر ایک ٹکڑا ذرا بڑا تھا۔ اور دوسرا چھوٹا۔ ترازو کا پلڑا جھک گیا۔ بڑے ٹکڑے میں سے تھوڑا سا کتر لیا۔ اب ترازو دوسری طرف جھک گئی۔ پھر دوسرا ٹکڑا اٹھا کتر لیا۔ یہی عمل جاری رکھا۔ یہاں تک کہ پنیر تقریباً ختم ہو گیا۔ جو بچا تھا اس کو منہ میں ڈال کر بولا "یہ میری مزدوری ہے" دونوں بلیاں منہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔ اور اپنا سا منہ لیکر چلدیں۔

(۱۶) بھتنے کی چڈہی (۱۶)

پہلے زمانے میں بھتنے اور بھتنیاں ہوا کرتی تھیں۔ ان کے رہنے کی جگہ مہریاں اور تاریک مقامات تھے۔ مگر جب سے

انگریزی عملداری ہوئی اور ملک سے آہستہ آہستہ جہل رخصت ہونے لگا، یہ بھی ساتھ کے ساتھ ناپید ہو گئے۔ جب دوپہر کے وقت لڑکے گلی کوچوں میں چڈہی چڈہی کھیلا کرتے تھے۔ یعنی باری باری ایک لڑکا دوسرے کی چڈہی یا یوں سمجھو پیٹھ پر سوار ہو کر ایک جگہ سے تھوڑی دور دوسری جگہ تک جایا کرتا تھا۔ اور یونہی یہ کھیل جاری رہتا تھا۔ بھتنا بھی ان بچوں میں آکر مل جاتا تھا۔ اور اس کی نشانی یہ تھی کہ اس کے سر پر چوٹی ہوتی تھی اور غنغنا کر ناک میں بولتا تھا۔ جب اس کی چڈہی دینے کی باری آتی۔ تو یہ غائب ہو جاتا۔ جس بچہ کی یہ چڈہی لے لیتا تھا، اعتقاد یہ تھا کہ وہ بیمار پڑ جاتا تھا۔ اور پھر ملّا سیانوں کے عمل و اعمال سے تندرست ہوتا تھا۔ بھتنے کے سر پر جو چوٹی ہوتی تھی اس کی نسبت یہ مشہور ہے کہ جب اس کو پکڑ لیا جاتا ہے تو بھتنا قابو میں آجاتا ہے۔ اسی سے یہ مثل بنی ہے۔ بھتنے کی چوٹی ہاتھ آگئی۔

باوا باوا اونٹ بکاؤ۔ بیٹا بہت مہنگا

باوا باوا اونٹ بکاؤ۔ بیٹا بہت سستا

ایک باوا بیٹے تھے۔ عسرت میں گزران کرتے تھے۔ بیٹا بازار میں گیا۔ وہاں اونٹ بک رہا تھا۔ دوڑا دوڑا گھر آیا اور کہا "باوا باوا اونٹ بکاؤ" باوا بولا "بیٹا کتنے کو" بیٹے نے کہا۔ "ایک ٹکے کو" بولا "بیٹا بہت مہنگا" پھر ان کے نصیب نے پلٹا کھایا اور باوا اچھا خاصا امیر ہو گیا۔ اسی طرح پھر ایک دن لڑکا بازار میں جا رہا تھا۔ وہاں اونٹ بک رہا تھا۔ گھر آکر باوا سے ذکر کیا۔ باوا بولے "بیٹا کتنے کو" اس نے کہا "ابا جان سوا لاکھ ٹکے کو" کہا "جا بیٹا خرید لے بہت سستا"

(۱۸) بکری ناؤ میں خاک اُڑاتی ہے (۱۸)

ایک شیر اور بکری دونوں ناؤ میں چڑھے سفر کر رہے تھے۔ شیر نے بکری کو مار ڈالنے کا ارادہ کیا۔ بکری بولی "آخر میرا قصور کیا ہے" وہ بولا "تجھے اب تک خبر بھی نہیں۔ تو ناؤ میں خاک اڑا رہی ہے"۔ وہ بولی "یہاں خاک کہاں دھری ہے"۔ بولا "اُڑی مردار زبان ملاتی ہے"۔ یہ کہہ کر جھپٹا اور پھاڑ ڈالا۔

(۱۹) بلوا بنانا (۱۹)

ایک میاں بیوی تھے۔ ان دونوں میں بڑا سہاگ تھا۔ بیوی کا ہے کو تھی گجری تھی۔ دیکھنے والے کا دل لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ مگر قسمت کے ہیٹے تھے۔ تنگا ترشی سے گزر ہوتی تھی۔ بیوی نے ایک دن میاں سے کہا "صاحب کچھ کمائی کا سلسلہ لگا لو"۔ بولے اس شہر میں تو روزگار کا پتہ نہیں۔ ہاں اگر پردیس چلا جاؤں تو شاید خدا کا کرنا ایسا ہو کہ روزگار لگ جائے۔ مگر تمہیں دل ڈھونڈیگا۔

اور جو ساتھ لے جاؤں تو پردیس کا موقع ہے۔ خدا جانے کیا بنے بیوی نے کہا۔ میں تمہیں ترکیب بتاتی ہوں۔ میرا ایک مرقع کھچوا لو۔ اس کو ہر وقت اپنی جان کے ساتھ رکھو۔ جب مجھ سے ملنے کو جی چاہے اسے دیکھ لیا کرو۔ مگر دیکھو ہوشیار رہنا کوئی اور نہ دیکھنے پائے۔ میاں نے ایسا ہی کیا۔ اور باہر جانے کی تیاری کرلی۔ کسی دیس میں نکل گئے۔ وہاں بادشاہ کے ہاں پہرے داروں میں بھرتی ہو گئے۔ ذات کے سپاہی بچہ تھے۔ یہی ان کا پیشہ تھا روز رات کو چپکے سے تصویر نکالتے اور بیٹھے اس سے باتیں کیا کرتے۔ کچھ دن میں یہ راز بڑے کے سپاہیوں پر کھل گیا۔ اور شدہ شدہ بادشاہ تک خبر پہنچ گئی۔ بادشاہ نے یہ تصویر چروا کر منگوائی اور دیکھ دا کھ کر اسی جگہ رکھوا دی۔ پھر وزیر سے مشورہ کیا کہ اس عورت کو کیونکر قابو میں لائیں۔ وزیر نے کہا پہلے اس کے میاں کو یہاں سے ٹالئے پھر ہم دونوں اس کے شہر چلکر اس کی بیوی پر ڈورے ڈالیں گے۔ سپاہی کو بلوایا گیا۔ وزیر نے کہا۔ میاں سپاہی بادشاہ سلامت کو تم سے ایک خدمت لینی

ہے۔ وہ کہنے لگا "میں دل و جان سے حاضر ہوں۔ نمک خوار ہوں۔ جو حکم ہو گا بجا لاؤں گا۔" وزیر نے دو ہزار روپیہ کے دو توڑے حوالہ کئے اور کہا ملکوں ملکوں پھرو۔ جہاں کہیں بلوے ملیں بادشاہ سلامت کے واسطے ایک جوڑا خرید لو۔" سپاہی نے دل میں کہا "بلوے کیسے ہیں میں نے تو یہ نام بھی کبھی نہیں سُنا۔ کہیں کوئی چال تو نہ ہو۔ روپے لیکر سیدھا اپنے دیس کو چل دیا۔ اور گھر آکے سب کچھ بیوی سے کہہ دیا۔ اس نے کہا "ضرور کوئی دھوکا ہے۔ کہیں میری تصویر کو بادشاہ سلامت نے تو نہیں دیکھ لیا۔" کہنے لگا "چوری چھپے دیکھی ہو تو خبر نہیں ظاہر ظہور تو نہیں دیکھی۔" بیوی بولی "اچھا دیکھا جائے گا۔ اب تم یہیں رہو اور گھر کے باہر نہ جانا۔ جو کچھ ہو گا ظاہر ہو جائے گا۔" اِدھر تو سپاہی گیا اُدھر بادشاہ اور وزیر نے بھیس بدل سفر کی تیاری کی۔ اور سپاہی کے دیس میں آن پہنچے۔ جب رات ہوئی تو یہ دونوں سپاہی کے گھر پر آئے اور کنڈی کھٹکھٹائی۔ میاں باہر جانے لگے۔ بیوی نے وہیں روک دیا۔ اور کہا میں جاتی ہوں اور خبر لاتی ہوں۔ کواڑ کے پیچھے سے

پوچھا۔ بھائی تم کون ہو رات کے وقت آنے کا کیا کام ہے۔ میرا میاں تو گھر نہیں ہے۔" بولے "ہم تمہارے پاس آئے ہیں۔ تمہارے میاں سے ہمیں کچھ سروکار نہیں۔ بادشاہ سلامت تم پر ہزار جان سے عاشق ہو گئے ہیں۔ وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔" یہ بولی میری ایسی قسمت کہاں کہ بادشاہ سلامت مجھ پر عاشق ہوں۔ مگر اس وقت میں اس قابل نہیں ہوں۔ کل نہا دھو کر اور بناؤ سنگھار کر کے تیار رہوں گی۔ آپ کل اسی وقت تشریف لائیے گا۔ ساری رات چوسر پچیسی ہو گی۔" وہ بولے اچھا اب ہم جاتے ہیں۔ کل آئیں گے اندر آئی اور سارا قصہ میاں سے کہا۔ میاں نے کہا اب کیا کرنا چاہیے۔ بولی میں سب کچھ سلٹ لوں گی۔ تم تو جو کچھ میں کہوں کئے جاؤ۔ میاں بولے تم بڑی عاقلہ وزیر ہو۔ ہم تو پہلے ہی جانتے تھے تمہارا سارا گمان ٹھیک نکلا۔ بولی ہاں دیکھ لیا میں کیا کہتی تھی۔ ضرور بادشاہ سلامت نے میری تصویر کسی نہ کسی طرح دیکھ لی ہے اچھا کل صبح اٹھکر تم دو مزدور بلا لانا اور ایک دیگ اور بہت سا سریش اور پرندوں کے پر بازار سے خرید لانا۔ جب یہ سب

سامان مہیا ہو گیا اور مزدوروں نے صدر کے دالان میں ایک بڑا گڑھا کھود دیا تو اس نے سریش دیگ میں جوش کر پرندوں کے پر اس میں ملا اس گڑھے میں بھر دیا۔ پھر اوپر سے سرکنڈے بچھا کاغذ رکھ کر مٹی ڈال دی۔ سارے گھر میں فرش فروش کر دیا۔ اور خود بن سنور کر ہو بیٹھی۔ میاں کو کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ جب رات کو وہ دونوں آئے تو ان کو اس جگہ لے گئی جہاں گڑھا تھا۔ یہ اندر جا پڑے اور سر سے پاؤں تک پر چمٹ گئے۔ اب کوٹھڑی کھول دی اور میاں کو نکال لیا۔ ان دونوں کو گڑھے میں سے نکال کر کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ رات بھر یہ وہاں پڑے سڑا کئے۔ صبح کو میاں کو بازار بھیجا اور دو بڑی بڑی زنجیریں اور کتے کے گلے میں ڈالنے کے پٹے منگوائے اور اس سے کہا کہ ایک چھکڑا بھی کرایہ پر کر کے ساتھ لیتے آنا۔ زنجیریں ان کے گلے میں ڈال چھکڑے پر سوار کر دیا۔ اور میاں کو ساتھ کیا اور ان کے سامنے یہ کہدیا۔ دیکھو صاحب ان دونوں بلوؤں کی راستہ بھر خوب خدمت کرتے جانا۔ کسی طرح کی بے آرامی نہ ہو۔ اور بادشاہ سلامت کے ہاں لیجا کر ان کے

سامنے پیش کر دینا۔ دونوں چھکڑے پر چڑھ اپنے دیس روانہ ہوئے
اور سپاہی صاحب چوکیداری کو ساتھ ساتھ۔ جب بادشاہ سلامت
کے شہر میں پہنچے۔ تو سپاہی نے بلوے حاضر کر دیئے۔ معلوم ہوا
کہ بادشاہ سلامت وزیر کے ساتھ سیر و شکار کو گئے ہوئے ہیں۔
اسی وقت ان کو محل میں کھونٹے سے بندھوا دیا۔ بادشاہ سلامت
اور وزیر صاحب کان دبائے کھونٹوں سے بندھے کھڑے
رہے۔ سارے گھر والوں نے آکر بلوؤں کی خوب سیر کی اور
بہت تعجب کیا۔ مگر پہچانا کسی نے نہیں۔ جب سوفتہ ہوا۔ تو ایک
لونڈی گزر رہی تھی اس کو اشارے سے بلایا۔ اور اپنا حال سنایا
وہ بڑی رازدار اور ہوشیار تھی چپکی چلی گئی۔ جب رات بڑی آئی۔
ان دونوں کو کھول کرلے گئی اور نہلا دھلا کر آدمی بنایا۔ صبح کو بادشاہ
سلامت دربار میں تشریف لائے۔ سپاہی صاحب بھی حاضر ہوئے
ان کے اس کام کے انجام دینے پر بہت تعریف ہوئی۔ وزیر کو
حکم ہوا کہ ہم نے بلوے دیکھ لئے اور ہمارا دل خوش ہو گیا۔ اب
ان کو جنگل میں چھڑوا دو۔ اپنے دیس چلے جائیں گے نہیں تو یہاں

پریشان رہیں گے۔ سپاہی کو انعام اکرام دیکر رخصت کر دیا اور کہا بھائی
اب تم اپنے دیس جاؤ اور آرام سے رہو۔ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں"

(۲۰) بھیرویں ہے تو ہماری بھی واہ (۲۰)

ایک گنوار کسی امیر کے ہاں محفل رقص و سرود میں حاضر تھا۔
رنڈی ناچ گا رہی تھی۔ لوگ اس سے طرح طرح کی فرمائشیں کرتے
اور وہ گا کر سناتی۔ کسی نے ان سے پوچھا۔ بھائی جو تم کہو وہ گوا دیں
بولے' اس سے کہو کہ بھیرویں گائے۔ اتفاق سے اس وقت وہ
بھیرویں ہی گا رہی تھی۔ جب اس سے کہا تو اس نے یہ جواب دیا
کہ یہ بھیرویں ہی تو ہے۔ گنوار بولا اگر بھیرویں ہے تو ہماری بھی واہ۔"

(۲۱) بڑی ٹیڑھی کھیر ہے (۲۱)

ایک اندھا تھا اس کی کسی نے دعوت کر دی۔ مثل مشہور ہے
اندھا نیوتا اور دو بلائے۔ اندھے کو جو آدمی دعوت میں لکڑی پکڑ کر
لے گیا تھا اس کو بھی اسی کے پاس دسترخوان پر کھانے کو بٹھا دیا۔

اندھا اس سے ایک ایک چیز کو پوچھتا جاتا تھا۔ یہ کیا ہے وہ کیا ہے۔ وہ بتاتا جاتا تھا۔ اس کے سامنے کھیر رکھی گئی۔ پوچھا کیا ہے بولا کھیر ہے۔ اندھے نے کبھی اپنی عمر میں نہ کھیر کا نام سنا تھا نہ چکھی تھی۔ اپنے ساتھی سے پوچھا۔ بھائی کیسی ہوتی ہے۔ وہ بولا سفید سفید ہوتی ہے۔ اندھے نے کہا سفید کس کو کہتے۔ بولا جیسے بگلا۔ اس نے کہا میاں بگلا کیسا ہوتا ہے۔ اس آدمی نے اپنا ہاتھ کہنی تک مروڑ کر اس کے سامنے کر دیا اندھے نے اپنے ہاتھ سے اس کو ٹٹولا اور بہت پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے میرے حلق میں پھنس کر رہ جائے گی۔

(۲۲) بڑا دم گلا ہے (۲۲)

یہ ایسے آدمی کو کہتے ہیں جو سخت بدمعاش ہو۔ اور جس کے کاٹے کا منتر ہی نہ ہو۔ وجہ تسمیہ یہ ہے۔ جو بیحد زہریلا سانپ ہوتا ہے۔ اور عمر بڑھ جاتی ہے۔ تو زہر کا اثر دم پر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور دم گلنے لگتی ہے۔ ایسے سانپ کو دم گلا کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے

بڑے چالباز کو محاورے میں یہی کہنے لگے ہیں۔

(۲۳) بابا زر خود می خورم (۲۳)

ایک پٹھان نووارد دہلی کے کوچہ و بازار میں گشت لگا رہا تھا
اس کی نظر رنگتروں کے چھبے پر پڑی۔ دریافت کیا کیا ہے؟ جواب
ملا، میوہ ہے کھاتے ہیں۔ چند پیسہ دیکر تھوڑے سے رنگترے
خرید لئے اور کھانے شروع کئے بہت مزیدار معلوم ہوئے۔ دل
میں کہا ہندوستان میں بڑے خوش ذائقہ میوے ہوتے ہیں پھر آگے
چلا تو کاچھی کچھ سرخ سرخ مرچیں لئے بیٹھا تھا۔ سمجھا یہ بھی کوئی رنگترے
کی قسم کی چیز ہے۔ کچھ دیکر خریدنا چاہا۔ کاچھی سمجھ گیا کہ نووارد ہے جانتا
نہیں یہ کیا چیز ہے دو پیسے لے لب بھر اس کے رومال میں ڈال دیں۔
آگے چل کر کسی جگہ بیٹھ گیا اور کھانی شروع کیں۔ اب تو نانی یاد آگئی
ناک اور منہ میں سے پانی بہنے لگا اور پسینے پسینے ہو گیا۔ لوگوں نے
کہا خان یہ کیا کرتا ہے؟ یہ تو مرچیں ہیں۔ وہ کھاتا جاتا تھا اور یہ کہتا جاتا
تھا۔ "بابا زر خود می خورم"۔

(پ) پیٹ ہے یا حضرت خواجہ خضر کی زنبیل (۲۴)

جس کے پیٹ میں الابلا سب اتری چلی جائے اور کبھی کھانے سے مُنہ ہی نہ موڑے، ایسے آدمی کے پیٹ کو حضرت خواجہ خضر کی زنبیل کہتے ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کے پاس ایک زنبیل یعنی بیگ ہے جس میں بڑی سے بڑی چیز سما جاتی ہے اور زنبیل اتنی ہی کی اتنی رہتی ہے۔ بعض دفعہ عمرو عیار کی زنبیل بھی کہہ دیتے ہیں اور اس زنبیل میں بھی یہی وصف بتلاتے ہیں

(ت) تم تو مجھے چھیڑو ہی گے (۲۵)

اس مثل کے ساتھ جو حکایت ہے۔ وہ کسی قدر فحش ہے لہذا نظر انداز کی گئی

(۲۶) تصویر کا دوسرا رُخ (۲۶)

(یہ مثل حال ہی میں اُردو زبان میں آئی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کا ماخذ انگریزی کی یہ حکایت ہے۔)

دو نائٹ گھوڑوں پر سوار (نائٹ انگریزی زبان میں سورما کو کہتے ہیں۔ یہ مرد مردانہ یورپ کی عہد متوسط کی تاریخ میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اُونچے بنے۔ پڑے پھرتے تھے۔ اور ہر ستم رسیدہ کے مددگار۔ جنگ اور دوسرے بہادری کے کاموں میں کارنمایاں ان کا کام تھا۔) آمنے سامنے آن پہنچے۔ راستہ میں چوراہا پڑا اس کے بیچ میں چبوترے پر ایک نائٹ کا بت لگا ہوا تھا اس کا ایک رُخ سُنہری تھا۔ اور دوسرا روپہلی۔ دونوں نائٹ اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ اور گھوڑے روک لئے۔ ایک نے کہا۔ واہ وا! کیا خوب سونے کا مجسمہ ہے۔ دوسرا بولا۔ سبحان اللہ کیا خوبصورت چاندی کا مجسمہ ہے۔ پہلا بولا اگر میری نگاہ غلطی نہیں کرتی تو یہ سونے کا ہے۔ دوسرے نے کہا میں یقینی اس کو چاندی

کا دیکھتا ہوں. بس اب ان دونوں میں لڑائی ٹھن گئی. نوبت بہ اینجا
رسید کہ دونوں نیزے تان مقابلہ پر کھڑے ہو گئے . اور ڈوئل یعنی
جنگ مبارزت کا پورا سامان ہو گیا. خوب کٹ کٹ کے لڑے.
زخمی ہو کر گھوڑوں پر سے گر پڑے. پھر بھی پڑے پڑے ایک
دوسرے پر گھونسیاں گھونٹ رہے تھے. اتنے میں اُدھر سے
ایک پادری گزرا. اس نے ان دونوں کی مدد کی اور دریافت کیا
آخر ڈوئل کی وجہ کیا تھی. معلوم ہوا اس فساد کی جڑ یہ مورت ہے. اس
نے بتایا کہ یہ مجسمہ ایک طرف سے سنہری دوسری طرف سے
روپہلی ہے. تم دونوں سچے ہو. اسی لئے عیسیٰ مسیح نے تمھاری
جانیں بچا لیں. لو اب میرے ساتھ چلو میں مرہم پٹی کروں. دونوں
خوش ہو گئے اور آپس میں دوستی قائم ہو گئی. پادری ان کو اُٹھا کر
اپنی خانقاہ کو لے گیا.

---
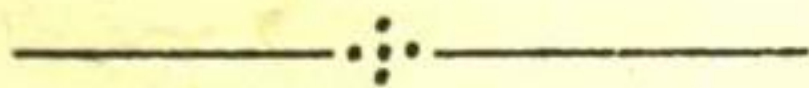
(۲۷) تیسرا مجھکو مارلیگا (۲۷)

ایک بنیا تھا۔ اس کو سفر کی سخت ضرورت پیش آئی۔ مگر جہاں جانا تھا، راستہ میں ڈاکو لگتے تھے۔ اور روزمرہ راہ مارتے تھے مجبور لٹیا ڈور لیکر ڈرتا ڈرتا رام نام جپتا چلا۔ ہر قدم پر اسے ڈاکو نظر آتے۔ پیچھے سے دو سوار آتے ہوئے دکھائی دئے۔ بس اب تو کیا تھا جان ہی نکل گئی۔ ضرور یہ ڈاکو ہیں اور مجھے لوٹے مارے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ جب وہ اس کے پاس سے گزرے تو بنیے نے بڑے تپاک سے سلام کیا۔ اور کہنے لگا۔ یہ بنیا ہجور (حضور) کی رئیت (رعیت) ہے۔ ہجور کی کہاں کی تیاری ہے۔ وہ کہنے لگے فلاں گاؤں کو ہم جارہے ہیں۔ ہم سرکاری سوار ہیں۔ بولا ہجور میں تمہارا اگریب (غریب) بنیا ہوں۔ حکم ہو تو تمہارے ساتھ لگ لوں راستہ میں ڈاکوؤں کا ڈر ہے۔ کئی ڈاکے اس طرف پڑ چکے ہیں ہجور آپ کی دیا ہو جائے تو صحیح سلامت پہنچ جاؤں بنیے کی جان بچاؤگے تو بڑا پن ہوگا۔ وہ بولے ارے بنیے ڈرتا کیوں ہے۔ جہاں ہم ہوں

وہاں ڈاکوؤں کا کیا کام۔ تو ہمارے ساتھ ساتھ چل تجھے کوئی خطرہ نہیں
بنیا بیچ میں اور دونوں سوار اِدھر اُدھر چلنے لگے۔ تھوڑی دور آگے
جا کر سامنے سے تین سوار آتے نظر پڑے۔ بنیا بولا۔ لیجے حضور ڈاکوؤں
نے آن لیا۔ ایک سوار نے مونچھوں پر تاؤ دیکر اور تلوار سنبھال کر کہا۔
ایک کو تو میں مار لوں گا۔ دوسرے نے کہا ایک کو میں موت کے
گھاٹ اُتار دوں گا۔ بنیا بولا حضور "تیسرا مجھکو مار لیگا"

(ج) جمع کے ڈبو آنکھیں کھولو (۲۸)

ایک سپاہی بچہ تھا قسمت سے لاچار۔ نوکری چاکری کہیں ملتی نہ
تھی۔ جب کھانے پینے کا سہارا نہ رہا، پیٹ سے مجبور ہو کر۔ ایک
ویرانہ کا راستہ لیا۔ وہاں سے ایک اُلّو پکڑ لایا۔ اس کو اُسی ساز و
سامان سے آراستہ کیا جیسے شاہی باز ہوتے ہیں۔ اڈّے پر بٹھایا۔
اس پر سرخ قند اور دھنک لپیٹی۔ پاؤں میں پینجنیاں پہنائیں۔ زنجیر
ڈال دی سر پر ٹوپی چڑھا دی۔ صبح سویرے اُٹھا۔ اُلّو کے اڈّے کو
ہاتھ میں لے۔ بنیے کی دوکان پر جا پہنچا۔ کہنے لگا لالہ جی اس باز کو

گروی رکھ لو۔ ہمیں روپیہ کی ضرورت ہے۔ ہم باہر جاتے ہیں۔
جب کما کر لائیں گے، اپنے باز کو چھڑا لیں گے۔ بنیا بولا۔ سپاہی
جی یہ کیا جناور ہے۔ بولا بھائی باز ہے باز۔ بنیے نے کہا یہ کیا
ہوئے ہے۔ اس سے بادشاہ شکار کھیلتے ہیں۔ ڈھونڈے نہیں
ملتا۔ ہزاروں روپیہ کو بکتا ہے۔ بنیے کو لالچ آگیا۔ الو کو گروی رکھ لیا
سپاہی کو روپیہ سنبھلوا دئے۔ وہ تو روپیہ لے چمپت ہوا اس نے
الو کا اڈا۔ دکان میں کواڑ کے سہارے کھڑا کر دیا۔ ایک آیا کہنے لگا
لالہ جی یہ کیا ہے، بولے میاں جی باج ہے باج۔ بادشاہ لوگ
اس کے ساتھ شکار کھیلتے ہیں۔ ہجاروں کو بکتا ہے۔ ڈھونڈے
نہیں ملتا۔ ارے واہ بے بنیے یہ تو الو ہے۔ نہیں میاں جی الو
کیوں ہونے لگا تھا۔ باج ہے باج۔ تم کو دھوکا ہوا۔ وہ چل دیا
دوسرا آن کھڑا ہوا۔ اس نے بھی یہی تقریر کی۔ اب تو بنیے کی آنکھیں
کھلیں اور دل ڈبک ڈبک ہونے لگا۔ دل میں کہنے لگا کہیں
سپاہی جی چال تو نہیں کر گئے۔ اب وہ دکان پر بیٹھا ہوا حسرت
بھری نگاہوں سے الو کی طرف دیکھتا ہے۔ الو آنکھیں بند کئے

چپ چاپ بیٹھا ہے۔ بار بار اس کی طرف منہ کر کے کہتا ہے۔" جمع کے ڈبو آنکھیں کھولو"۔ مگر جمع کا ڈبو کسی عنوان آنکھیں نہیں کھولتا۔

(۲۹) جب پار اترے تو جوں ماردی (۲۹)

ایک صاحب سفر کر رہے تھے۔ راستہ میں ایک ہولناک دریا پڑا۔ نواڑے پر سوار ہو پار جانے لگے۔ بیچم بیچ دریا میں نواڑا ڈگمگانے لگا۔ موت سامنے کھڑی نظر آئی۔ اللہ میاں سے دعا کی اور منت مانی۔ اگر ساتھ خیر کے جان و مال کی سلامتی میں دریا پار اتر گیا تو پار جا کر ایک بکرا اللہ راہ دوں گا۔ خدا کی شان دیکھو صیحح سلامت نواڑا پار لگ گیا۔ جب کنارے پر پہنچے تو نیت میں فرق آگیا۔ دل میں کہنے لگے۔ بکرے میں ہے ہی کیا۔ بس جان ہے۔ تو یوں کہو۔ اللہ راہ جان دینی ٹھہری۔ سر میں سے ایک جوں پکڑ مار ڈالی۔ لو منت پوری ہو گئی۔

———— ⁘ ————

(۳۰) جو بولے سو گھی کو جائے (۳۰)

ایک امیر صاحب تھے۔ ان کو صاحبزادی کی شادی درپیش تھی۔ نیوتت کے واسطے بہت گھی درکار تھا۔ اس زمانہ میں دہلی میں گھی کا بھاؤ بہت چڑھا ہوا تھا۔ صحبت میں یہی ذکر ہو رہا تھا۔ ایک مصاحب پنجاب کے رہنے والے حاضر تھے اور حال ہی میں سفر سے واپس آتے تھے۔ کہنے لگے ہمارے پنجاب میں تو گھی بہت سستا ہے، روپیہ کا پان سیر بک رہا ہے۔ امیر صاحب بولے سنو بھائی ابھی چلے جاؤ اور ہمارے واسطے پچیس من گھی لے آؤ۔ یہ بیچارہ ابھی تو اس زمانہ کے دشوار گزار سفر سے واپس آیا تھا۔ تکان بھی پوری نہ اتری تھی مجبوری جانا پڑا۔ بھلا حکم کیسے ٹالا جا سکتا تھا۔
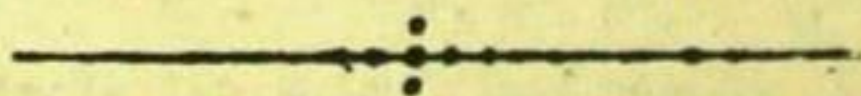
(بچ) چڑیا کی جیب مانڈے کا پھپولا (۳۱)

ایک میاں بیوی تھے۔ بیوی میاں کی بڑی چاہیتی تھیں۔ میاں کے ساتھ بڑے نخرے کرتی تھیں۔ ان پر یہ رعب جمار کھا تھا کہ میں کچھ کھاتی ہی نہیں۔ ایسی نازک نازنیں ہوں۔ میاں روز ایک چڑیا کی جیب اور مانڈھے کا پھپولا لادیا کرتے تھے۔ یہ ان کی خوراک تھی (آپ مانڈھے کا پھپولا نہ سمجھے ہوں گے۔ اب مانڈھے دنیا میں کہاں۔ آج سے پچاس برس پہلے ہوتے تھے یہ ایک قسم کی میدے کی روٹی تھی۔ جو پوری سے باریک اور اتنی بڑی کہ پورے طباق پر آجائے۔ اس میں پھپولا کہاں۔ اگر ہوگا تو بھی مکھی کے سر کے برابر۔ یہ پوریاں پلاؤ متنجن کے طباقوں پر ڈھانکی جاتی تھیں۔ کہ طورے کا کھانا خوان پوش کو چکنا نہ کردے اب نہ طورے نہ مانڈھے) مگر میاں دیکھتے تھے کہ بیوی اچھی خاصی موٹی مشٹنڈی ہورہی ہیں۔ اگر کھاتی نہیں تو کیسے جیتی ہیں۔ ان کو کچھ شبہ سا ہونے لگا۔ ایک دن بیوی سے تو یہ کہا کہ میں باہر جاتا

ہوں اور کچھ دیر میں آؤں گا۔ مگر مکان کے کسی کونہ میں دبک
رہے۔ جب بیوی نے دیکھ لیا کہ میاں چلے گئے۔ تو لونڈی
سے کہا۔ چل دروازے کی کنڈی دے اور میرے کھانے کی
تیاری کر۔ اس نے کھچڑی پکائی۔ بڑے بڑے روغنی روٹ
سینکے اور تلوں کو گڑ ڈال کر ہاون دستے میں کوٹ تل کٹ
کا میدہ بنایا۔ یہ سب بیگم صاحب کی مرغوب غذا تھی۔ انھوں نے
خوب کھچڑی میں گھی ملایا اور سب کچھ کھا پی پانی ڈگڈگا کر پیا اور سیج
پر جا سنائیں۔ لونڈی نے جا کر دروازہ کی کنڈی کھول دی۔ میاں
چپکے سے باہر نکل گئے۔ باہر جا کہیں سے ایک کوڑیالا سانپ
لے ہنڈیا میں رکھ گھر میں لے آئے۔ بیوی کے پاس آ کر ہنڈیا
کھولی اور کہا دیکھنا بیوی یہ کیا ہے۔ بولی۔ میاں یہ تو ہلتا ہے۔ بیوی
کھچڑی میں گھی ملتا ہے۔ میاں یہ تو موٹا ہے۔ بیوی ہاتھی کا سا روٹا ہے
میاں یہ تو کالا ہے۔ بیوی تل کٹ کا نوالہ ہے۔ اب بیوی سمجھیں
کہ میاں پر سارا نزاکت کا راز کھل گیا۔ اس دن سے نخرے کرنے
چھوڑ دیئے۔

(۳۲) چل لونڈی میں آتا ہوں

ایک گھر میں تین آدمی تھے۔ میاں بیوی اور لونڈی۔ عید آئی
سب کے بناؤ سنگھار کی تیاری ہوئی۔ میاں نے بیوی کے واسطے
نئی سونے کی بالیاں گھڑوائیں۔ اپنے لئے انگوٹھی خریدی۔ اور
لونڈی کو مسّی لادی۔ جب عید کا دن ہوا، بیوی نے نئی بالیاں پہنیں
میاں نے انگوٹھی۔ لونڈے نے مسّی ملی۔ میاں نماز پڑھکر آئے اور
بیٹھک میں بیٹھ گئے۔ کھانا تیاّر ہوگیا۔ بیوی نے لونڈی سے کہا
جا میاں کو بلا لا۔ لونڈی نے جاکر ہونٹ باہر نکال کر میاں سے کہا
میاں میاں بیوی بلاتی ہیں۔ اس طرح سے کہ میاں مسّی خوب دیکھ
لیں۔ میاں نے انگلی آگے کر کے اور ہلا ہلا کر کہنے لگے۔ چل لونڈی
میں آتا ہوں، چل لونڈی میں آتا ہوں۔ اُنھوں نے بھی اترا کر اپنی انگوٹھی
لونڈی کو دکھا دی۔ جب گھر میں آئے تو بیوی گاؤ تکیہ سے لگی بیٹھی تھیں
دونوں طرف گردن مٹکا مٹکا کر اور کان ہلا ہلا کر کہنے لگیں۔ میاں یاں
بیٹھو۔ میاں یاں بیٹھو۔ انھوں نے بھی اپنی بالیوں کا انداز دکھا دیا۔

(۳۳) چور کی ڈاڑھی میں تنکا (۳۳)

کسی گاؤں میں چوری ہوگئی۔ بہت تلاش کیا، چور کا پتہ نہ ملا۔ پاس کے گاؤں میں ایک بوجھ بجھکڑ رہتے تھے۔ (بوجھ بجھکڑ اسے کہتے ہیں جو عقلمندی اور ہوشیاری میں مشہور ہو) ان کا دور دور شہرہ تھا۔ جس کا مال چوری گیا تھا وہ ان کے پاس گیا۔ اور مال برآمد ہونے کی تدبیر پوچھی۔ بوجھ بجھکڑ صاحب بولے، ہم مال برآمد کرا دیں گے۔ تم گاؤں میں جاؤ اور سارے گاؤں کی ضیافت کردو شکرانہ پکانا اور چھوٹے بڑے سب کو ایک جگہ بٹھا کر کھلانا۔ ہم بھی وقت پر آجائیں گے۔ شکرانہ تیار ہو گیا۔ سب جمع ہو گئے۔ کھانے کو ہو بیٹھے۔ اتنے میں بوجھ بجھکڑ صاحب بھی تشریف لے آئے۔ سب کے بیچ میں کھڑے ہو کر کہنے لگے۔

بھائیو! میں نے چور کا پتہ لگا لیا ہے۔ بس اس کی یہ نشانی ہے کہ اس کی ڈاڑھی میں تنکا ہے۔ چور بیچارا یہ سمجھا کہ کہیں ان کو میرا پتہ تو نہیں چل گیا۔ انھوں نے کسی ترکیب سے میری ڈاڑھی

میں تنکا تونہیں رکھوا دیا۔ منہ موڑ کے جلدی جلدی ڈاڑھی پھٹکارنے لگا۔ یہ بولے اسے پکڑلو یہی چور ہے۔ اس طرح چوری کا حال کھل گیا۔ اور مال مل گیا۔

(۳۴) چوری کی علّت کبھی نہ جائے
اور
سمدھن کا تکلا چُبھ چُبھ جائے

ایک بیوی کو چوری کی علت تھی۔ بیٹے کو بیاہنے چڑھیں۔ برات لیکر سمدھیانے گئیں۔ جب سمدھیانے کے گھر میں پہنچیں تو انگنائی میں چرخے کا تکلا پڑا ہوا تھا۔ یہ تنگ مہری کا پاجامہ پہنے ہوئے تھیں۔ اٹھا مہری میں گھسا لیا۔ اور اندر جا بیٹھیں۔ اب ذرا سا بھی کھسکتی ہیں تو تکلا پنڈلی میں چبھتا ہے۔ اس نے چبھ چبھ کر گھاؤ ڈال دیا۔ اور پنڈلی لہو لہان ہو گئی۔ خون پاجامہ کی مہری سے بہنے لگا۔ عورتوں نے دیکھا۔ پنڈلی پر سے پاجامہ چڑھا کر تکلا نکالا اور کہنے لگیں۔ چوری کی علت کبھی نہ جائے اور سمدھن

کا لکلا چھچھ چھ جائے۔

(۳۵) چھوڑو بی بلائی چوہا لنڈورا ہی بھلا (۳۵)

ایک بلّی نے چوہا پکڑا۔ اس کی دم تو بلّی کے منہ میں رہ گئی۔ اور چوہا نکل بھاگا۔ جب بلّی کے ہاتھ سے شکار نکل گیا اور اس کی زد سے دور جا کھڑا ہوا۔ تو بلّی بولی۔ میاں چوہے، اب تم جی کر کیا کرو گے۔ آؤ میں تمھیں کھا ہی لوں۔ وہ بھاگ کر کسی بل میں گھس گیا۔ وہاں سے کہنے لگا۔ چھوڑو بی بلائی چوہا لنڈورا ہی بھلا۔

(۳۶) چیں بلوائی (۳۶)

غدر سے پہلے دہلی کے سارے محلّوں میں کوچہ بندیاں تھیں۔ اس کے یہ معنی ہوتے کہ کوچوں پر پھاٹک چڑھے ہوئے تھے اور ہر محلہ کا ایک میر محلہ ہوتا تھا۔ اس کی محلّے پر اچھی خاصی حکومت ہوتی۔ محلّے کے پھاٹک رات کو بند ہو جاتے اور محلہ دار کی طرف سے چوکی دار پھاٹک پر رہتا تھا۔ انجان آدمی کی آمد رفت پر

روک ٹوک ہوتی تھی۔ ایک محلّے کا بچہ دوسرے محلّے میں کم جایا کرتا تھا اور جو اتفاق سے نکل گیا تو سارے محلّے کے بچّے چیل کوّوں کی طرح سے آ سے چمٹ جاتے تھے اور خوب ہاتھا پائی ہوتی تھی۔ یہ بیچارا اکیلا اور اُدھر شیطانی لشکر۔ اُس سے مطالبہ ہوتا تھا کہ چیں بول دے تو اس کی رہائی ہو۔ چیں بولنے سے مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس لونڈے نے وہاں کے لونڈوں کی اطاعت قبول کرلی۔ مگر یہ بڑی ذلّت کی بات تھی۔ اگر لونڈا ذرا تگڑا اور جیدار ہوتا تو چیں بولنے پر راضی نہیں ہوتا اور جم کر ان کا مقابلہ کرتا تھا۔ اس میں تھوڑی بہت چوٹ پھیٹ بھی آجاتی تھی۔ پھر محلہ کے بڑے بوڑھے جمع ہوجاتے اور بیچ بچاؤ کر دیتے۔ اس کو اس کی بہادری پر شاباشی دیتے، پیٹھ ٹھوکتے اور شربت سے اس کی تواضع کرتے۔ اب یہ محلّے کے لونڈوں کا ذبیل نہیں بلکہ یار بن جاتا۔ اگر خدانخواستہ کہیں چیں بولدی تو عمر بھر کو اس کا ذبیل ہوگیا۔

(۴۷) چوپائی ہوا چلا دو (۴۷)

لکھنؤ میں دو بڑے مرشد تھے۔ جھوٹی گواہی دینے میں
طاق۔ روز کسی نہ کسی عدالت میں جا کر گواہی دے آتے تھے۔
اور کچھ ایسا تک سے تک جوڑ کر کہتے کہ بالکل سچ معلوم ہوتا۔
ساری عدالتیں جانتی تھیں کہ بڑے جھوٹے ہیں مگر کچھ کر نہ سکتی
تھیں۔ ایک مجسٹریٹ صاحب جو بدلی ہو کر آئے اُنھوں نے
ارادہ کر لیا، کسی نہ کسی طرح ان حرامزادوں کو پھانسیں گے۔ یہ
دونوں کسی پتنگ بازی کے جھگڑے میں ان کی عدالت میں
پیش ہوئے۔ پہلے ایک نے گواہی دی۔ جب شہادت ختم
ہو گئی تو عدالت نے یہ سوال کیا۔ اُس وقت ہوا کس رخ کی تھی۔
اُس نے جواب دیا۔ پُروا تھی۔ پھر دوسرا گواہ طلب ہوا۔ شہادت
کے اختتام پر۔ اس سے بھی یہی سوال کیا گیا۔ مجسٹریٹ صاحب
سمجھے کہ اب اس کو دھر لیں گے۔ مگر یہ شخص آفت کا پرکالہ تھا۔ تاڑ
گیا کہ ہوا کے متعلق سوال کرنے میں کوئی راز ہے۔ دل میں کہا

اگر کوئی سمت بتاتا ہوں۔ تو معلوم نہیں پہلے نے کونسی سمت بتائی ہوگی۔ میں جھوٹا پڑتا ہوں۔ فوراً تدبیر سوجھ گئی، بولا۔ حضور چوپائی چل رہی تھی۔ مجسٹریٹ صاحب ششدر رہ گئے۔ اور کچھ بھی نہ پیش گئی۔ دونوں سرخ رو چلے آئے۔

(۳۸) حضور کا نوکر ہوں بیگن کا نوکر نہیں

ایک نواب صاحب تھے۔ ان کا دسترخوان بہت فراخ تھا۔ دونوں وقت کے کھانے پر مصاحب ندیم اور شوربے چٹ حاضر رہتے تھے۔ نواب صاحب رات کا خاصہ نوش جان فرما رہے تھے۔ دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے لگے ہوئے تھے۔ ان میں بیگن کا سالن بھی تھا۔ نواب صاحب کو بیگن کا سالن بہت پسند آیا۔ اور اس کی تعریف کرنے لگے۔ ایک مصاحب بولا۔ حضور بیگن کا کیا کہنا۔ ملاحظہ ہو اس کو کس کس طرح پکاتے ہیں۔ بورانی بنتی ہے اور خاقانی کہتا ہے شعر

پس از سی سال این معنی محقق شد بخاقانی　　که بورانی است بادنجان و بادنجان بورانی

اور بریانی سے کھائی جاتی ہے۔ کچا پکا بھرتا بناتے ہیں۔ سالن
میں پکاتے ہیں۔ سادہ چھونکتے ہیں۔ دُلمہ پکتا ہے۔ چنے کی دال
کے دالچہ میں ڈالتے ہیں اور پھر لطف یہ کہ الٹے ہاتھ سے بھی
پکاؤ تو مزے کے پکیں۔ صورت ملاحظہ ہو۔ گول گول گبند۔ ساقد و
قامت مناسب۔ رنگ نیچنی رسبحان اللہ کالو تو چاندی کے پتر ے
ان میں موتی جڑے ہوئے۔ انہی خوبیوں کی وجہ سے تو اللہ میاں
نے اس کے سر پر زمردیں تاج رکھا ہے۔ القصہ کھانا ختم ہوا۔ اور
مجلس برخاست ہو گئی۔ نواب صاحب محل میں داخل ہو گئے۔
مزے میں آکر بیگن ایک دو نوالہ زیادہ کھا گئے تھے۔ رات بھر
پیٹ میں قراقر رہی۔ نیند بھی اچھی نہیں آئی۔ صبح کو جب دیوان
خانہ میں برآمد ہوئے تو فرمانے لگے، بیگن بھی بڑی نالائق چیز ہے
رات بھر اس نے مجھے دق کیا۔ کروٹیں بدلتے بدلتے صبح ہو گئی
رات والے مصاحب نے جو بیگن کے مداح تھے اب یوں
فرمانے لگے۔ حضور بیگن کے برابر تو کوئی بری ترکاری ہی نہیں۔
پہلے نام سنئے بے گن یعنی بغیر نفع یا فائدہ والا پھر رنگ دیکھئے

کالا کالا لوکٹ سا۔ کالو تو اندر کیڑے ہی کیڑے ہے۔اس کی انہی برائیوں
کی وجہ سے تو اللہ میاں نے اس کے دماغ میں میخ ٹھونکدی ہے
نواب صاحب بولے، یار تو بھی عجیب آدمی ہے۔ رات کو تو
تونے بیگن کی تعریف کے پل باندھ دئے تھے۔اب ہجو کر رہا ہے
مصاحب نے دست بستہ عرض کی حضور میں حضور کا نوکر ہوں بیگن کا
نہیں۔ فرمایا بھائی تو تو تھالی میں کا لڑھکنا بیگن ہے۔

حساب جوں کا توں کنبا ڈوبا کیوں (۳۹) ح

ایک دہقاں نے اپنے لڑکے کو کسی بڑے گاؤں کے
مدرسہ میں بٹھا دیا۔ وہ پڑھ لکھکر قابل ہوا یا نہیں ہوا۔ مگر اپنے کو بہت
ہوشیار سمجھنے لگا۔ اور گھر والے بھی اس کو پڑھا لکھا اور ہوشیار
جاننے لگے۔ جب واپس آیا تو گھر والوں کو سفر پیش آیا۔ راستہ میں
ایک ندی لگتی تھی۔ اس میں چڑھاؤ آیا ہوا تھا۔ جب ندی کنارے
پہنچے تو لڑکا ناؤ میں بیٹھکر ندی پار گیا اور ساری ندی کی گہرائی کو بانس
لیکر ناپا۔ پھر واپس آیا۔ کاغذ پنسل لیکر گہرائی کا اوسط کے قاعدہ سے

اوسط لکالا۔ معلوم ہوا کہ پانی آدمی ڈباؤ نہیں ہے۔ بولا کشتی والوں کو ٹکے دینے بے سود۔ بس پاؤں پاؤں چلو پانی ڈباؤ نہیں میرا ذمہ خیر صلا سے پار ہو جاؤ گے۔ ملاّحوں نے لاکھ منع کیا مگر انھوں نے نہیں مانا۔ ندی میں اتر کر چل پڑے۔ جب بیچم بیچ پہنچے تو ڈوب کر رہ گئے۔ یہ بیٹھا کنارے پر روتا جاتا اور حساب کی جانچ کرتا جاتا اور یہ کہتا "حساب جوں کا توں کنبا ڈوبا کیوں"۔

(۴۰) حبشی کی ٹوپی (۴۰)

ایسی ہی سی مثل فارسی میں بھی موجود ہے۔ وہ ایک فقرہ سعدی کی گلستاں کا ہے۔ ہر کس را عقل خود بکمال نماید و پسر خود بجمال۔ ایسے ایسے بہت سے فقرے اور شعر سعدی کے ضرب المثل ہو گئے ہیں اور غالباً یہ کسی عربی ضرب المثل کا ترجمہ ہے۔ جگہ جگہ گلستاں میں عربی کی مثلوں کے ترجمے پائے جاتے ہیں اور وہ کچھ ایسے انداز سے کہے گئے ہیں کہ خود ضرب المثل بن گئے ہیں۔ حبشی کی ٹوپی کا خیال شاید فارسی کی ضرب المثل سے اخذ کیا گیا ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ تھا اس کے دربار میں اس مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی کہ ہر شخص اپنے بچہ کو تمام دنیا کے بچوں سے زیادہ خوبصورت خیال کرتا ہے۔ کوئی اس کی تصدیق کرتا تھا اور کوئی تردید۔ آخر کار یہ قرار پایا کہ آدمی کی اس طبع زاد رغبت کا امتحان کیا جائے۔ اور ایسے پیرایہ میں کیا جائے کہ کسی کو شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ رہے اس کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ حبشی سے زیادہ کوئی قوم بدشکل نہیں ہوتی۔ لہذا بادشاہ نے دوسرے دن دربار کیا اور امرا کے ساتھ ان کے بچوں کو بھی بلوایا۔ ملازمین دربار کو بھی حکم ہوا کہ اپنے بچے ساتھ لائیں۔ چنانچہ ایک حبشی غلام مع اپنے بچے کے حاضر تھا بادشاہ سلامت نے ایک زرنگار ٹوپی حبشی کے حوالہ کی اور یہ کہا کہ حاضرین دربار میں جو لڑکا سب سے زیادہ حسین تم کو معلوم ہو۔ اس کو یہ ٹوپی اڑھادو۔ وہ دربار کے سارے بچوں کو غور سے دیکھتا پڑا پھرا۔ آخر کار ٹوپی اپنے بچے کو اڑھا دی۔ یہ سب بچوں سے بدشکل تھا۔ اس سے بادشاہ سلامت اور سب پر یہ ثابت ہو گیا کہ اپنی اولاد سے زیادہ آدمی دوسرے کی اولاد کو خوبصورت نہیں سمجھتا

(خ) خالہ چاندنی کا کنبا (۱۴)

دو بہنیں تھیں ایک بی چاندنی اور دوسری بی مُہنی بی مہنی کے میاں خوش حال تھے اور امیرانہ گزران ہوتی تھی۔ ان کے ہاں اکلوتی لڑکی تھی۔ بی چاندنی کے گھر میں تنگی تھی۔ اور برے حال گزارہ ہوتا تھا۔ ان کے دو لڑکے تھے۔ ادھر یہ دونوں پروان چڑھے۔ ادھر لڑکی بھی سیانی ہوگئی۔ خالہ چاندنی یہ مسودہ پکا کر بہن کے گھر گئیں۔ کہ کسی طرح ایک لڑکے کو ان کی نظر چڑھائیں۔ اُن کی بیٹی بیاہ کر لڑکے کو کھاتے پیتے گھر کا کردیں۔ وہاں جا کر اتریں تو بہن سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ وہ جانتی تھی کہ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔ ان کے ہاں کے چھوٹے بڑے سب کی عقل کو کو کولے گئی ہے۔ اُٹھاؤ مونڈھا کنبے کا کنبا ہی بھونڈا۔ بہن کو ٹالنے کی غرض سے کہا کہ ابھی لڑکی کی عمر ہی کیا ہے۔ خدا خیر سے وہ دن تو کرے۔ جب دیکھا جائے گا۔ بی چاندنی بولیں تو خیر نسبت ہی کر لو شادی پھر ہو جائے گی۔ بولیں تمہارے بہنوئی سے مشورہ کرلوں۔ اور بہن ساری بات

یہ ہے کہ تمھارے لڑکے کچھ اول جلول سے ہیں۔ بہن بولی ہاں
تم سچ کہتی ہو۔ پہلے ایسے ہی تھے مگر اللہ رکھے اب بڑے ہو کر
ہوشیار ہو گئے ہیں۔ اچھا تم ان کو بلا کر دیکھو تو سہی میں کل بڑے
لڑکے کو بھیجوں گی۔ گھر آکر بڑے لڑکے سے کہا۔ بیٹا کل صبح کو نہا
دھو کر بناؤ کر کے خالہ کے ہاں جانا۔ دیکھو بہت ادب قاعدے کا خیال
رہے۔ اگر کسی بات میں کسر ہوئی تو وہ اپنی بیٹی نہیں دیں گی۔ وہ بولا
اماں جان کیا آپ مجھے بیوقوف سمجھتی ہیں۔ میں ان سے جا کر ایسی
باتیں ملاؤں تو سہی کہ اگر بیٹی نہ دیتی ہوں تو بھی دیدیں۔ صبح صاحبزادے
خالہ کے گھر جا پہنچے۔ جاڑے کا موسم تھا۔ خالہ گاؤتکیہ سے لگی
قالین پر بیٹھی تھیں۔ لڑکے نے سامنے سے آکر آداب کیا۔ بولیں
بیٹا جیتے رہو۔ آؤ میرے پاس بیٹھو۔ وہ ادب سے قالین سے
نیچے چاندنی پر ہو بیٹھا۔ خالہ بولیں میاں اوپر کو بیٹھو جاڑا ہو رہا ہے۔
تمھارے پاؤں ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ صاحبزادے بولے خالہ اماں
آپ اس کا خیال نہ کریں۔ میں اپنی بغلوں کے بالوں ہی میں خوب
گرم رہتا ہوں۔ خالہ کو یہ سن کر سخت حیرت ہوئی اور آنکھیں نیچی کر کے

چپ ہو رہیں۔ پان وان دیکر لڑکے کو رخصت کردیا۔ دوسرے دن
خالہ چاندنی آن موجود ہوئیں اس لئے کہ بہن سے جواب لیں۔ اس
نے کہا، تمہارا لڑکا بڑا بدتمیز ہے۔ ایسی بات مجھ سے کہی۔ وہ
بولیں ہاں بوا تم سچ کہتی ہو وہ ایسا ہی ہے مگر میرا چھوٹا لڑکا بہت
ٹھیک ہے۔ کل میں اس کو بھیجوں گی تم ضرور پسند کروگی۔ دوسرے
صاحب کو بھیجا اور کہہ دیا بیٹا دیکھیو جہاں خالہ بیٹھی ہوں ان کے پاس
جا بیٹھنا اپنے بڑے بھائی کی سی حرکت نہ کرنا۔ وہ بولا بڑے بھائی
صاحب تو عقل کے دشمن ہیں۔ اماں جان دیکھ لینا۔ میں جاکر کام
بنالوں گا۔ وہ ضرور اپنی بیٹی مجھے دیدیں گی۔ خالہ صاحبہ کے ہاں
آن پہنچے۔ جب گھر میں گھسے تو پوچھا خالہ اماں کہاں ہیں۔ نوکر چاکروں
نے کہا۔ میاں بیٹھ جائیے۔ آپ کی خالہ صاحبہ پاخانہ میں ہیں۔ ابھی نکلتی
ہیں۔ انھوں نے اماں کے کہنے کو گرہ میں باندھ لیا تھا۔ جہاں خالہ
ہوں وہیں جا بیٹھنا۔ سیدھا پاخانہ کا رخ کیا۔ نوکروں نے بڑی مشکل
سے روکا۔ خالہ بیچاری جلدی جلدی پاخانہ سے باہر آئی اور صاحبزادے
کو دالان میں لیجاکر بٹھایا۔ چھٹتے ہی انھوں نے یہ فرمایا، بڑے بھائی

صاحب بڑے جھوٹے ہیں۔ بھلا ان کی بغلوں میں بال کہاں اور آپ
سے یہ کہہ دیا کہ میں اپنی بغلوں کے بالوں ہی میں گرم رہتا ہوں۔
میں نے ان کی بغلیں دو چار دن ہوئے اپنے ہاتھ سے مونڈی
تھیں۔ یہ ساری گفتگو سن کر خالہ کے تو ہوش جاتے رہے اور دل
میں کہا، کیسے کم عقلوں سے پالا پڑا ہے۔ ان کو جوں توں خاطر
تواضع کرکے رخصت کیا۔ پھر بی خالہ چاندنی آن دھمکیں اور جواب
مانگا۔ بہن نے سارا قصہ سنایا۔ بولیں تم سچ کہتی ہو۔ یہ دونوں ایسے
ہی نالائق ہیں۔ مگر تم کو ان سے کیا کام ہم میاں بیوی کو دیکھو اور
اپنی بیٹی دیدو۔ کل میں ان کو بھیجوں گی۔ تمھارے میاں بچوں کے
باوا سے بات چیت کرلیں گے۔ گھر آکر میاں سے کہا۔ صاحب
کل تم میری بہن کے ہاں جاؤ اور بچوں کی نسبت کی بات چیت
اپنے بھائی سے کرو۔ وہ بولے میں ضرور جاؤں گا۔ اُجلا جوڑا نکال دو
نہا دھو کر اُجلے کپڑے پہن کر وہاں جاؤں گا۔ بیوی نے کہا بہت
اچھا۔ صبح کو جوڑا بغل میں مار نہانے کے لئے دریا کو چلے۔ بیوی لاکھ
روکتی رہی اور کہتی رہی کہ گھر میں ہی نہالو۔ گرم پانی کئے دیتی ہوں

مگر وہ بولے جاڑوں میں دریا کا پانی گرم ہوتا ہے میں اچھی طرح دل کھول کر نہا دھو کر بھائی صاحب کے ہاں جاؤں گا۔ دریا پر جا کپڑے اتار کنارے پر رکھ اندر اتر گئے۔ کوئی تاک میں لگا ہوا تھا۔ ان کی آنکھ بچی اور وہ کپڑے لے چلتا بنا۔ جب نہا دھو کر باہر نکلے تو کپڑے میلے اور اُجلے سب غائب۔ دل میں بہت گھٹے اور سوچا کہ کیا کروں۔ اگر گھر واپس جاتا ہوں تو بیوی جان کو آجائے گی۔ کسی صورت سے ہو بھائی صاحب کے ہاں جانا چاہئے نہیں تو کام بگڑ جائے گا۔ بچوں کی شادی کا معاملہ ہے۔ دریا کے قریب ایک باغ تھا اس میں گھس گئے دو کیلے کے پتے توڑے اور آگے پیچھے باندھ لئے۔ سامنے ایک کمہار کی گدھی چر رہی تھی سوچا کہ سمدھیانے پیدل جانا تو ٹھیک نہیں۔ چلو اس پر سوار ہولیں۔ گدھی پکڑ اس پر بیٹھ ننگے دھڑنگے سمدھیانے روانہ ہوئے۔ راستہ میں بچوں کی فوج پیچھے پیچھے تالیاں بجاتی ساتھ ہولی۔ جب سمدھیانے میں اس شان سے پہنچے تو خیر یہ ہوئی کہ نوکروں نے ان کو پہچان لیا اور فوراً گدھی سے اتروا دروازہ کے اندر کر دروازہ

بند کر دیا کہ یہ تماشا تو بند ہو۔ پھر میاں کو اطلاع کی وہ باہر آئے۔ ان کو اس حالت میں دیکھ کر سر پیٹ لیا اور گھر میں سے کپڑے منگوا کر پہنائے۔ خاطر تواضع کی۔ انھوں نے اپنی ساری سرگذشت سنائی پھر بڑی مشکل سے ان کا عذاب کاٹا۔

(۴۲) دیکھئے اونٹ کس کل بیٹھے (د)

دو اونٹ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کو ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ ایک پر چارا لدا ہوا تھا اور دوسرے پر چوڑیاں۔ چارے والا اونٹ گردن موڑ موڑ کر چارے پر منہ مارتا جاتا۔ اور کھاتا جاتا۔ نیہار یہ دیکھ دیکھ کر ہنستا۔ گویا یہ کہتا تھا کہ اونٹ منزل پر پہنچتے پہنچتے کھا کھا کر چارا آدھا کر دیگا۔ میں مزے میں ہوں میری چوڑیاں اونٹ نہیں کھا سکتا۔ پوری کی پوری منزل تک پہنچ جائینگی۔ چارے والا اس کو دیکھتا تھا اور یہ کہتا تھا۔ میاں دیکھئے اونٹ کس کل بیٹھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ دل میں کہا یہ کیا بکتا ہے میری چوڑیوں کو کوئی ضرر نہیں۔ آخر کار منزل پر جا پہنچے۔ نیہار کا

جو اونٹ بیٹھا تو ایک کروٹ سے بیٹھا۔ اس طرف کی ساری چوڑیاں چکنا چور ہو گئیں۔ دل میں اپنے نقصان پر بہت افسوس کیا چارے والا بولا۔ دیکھا میاں کہتا نہ تھا کہ دیکھئے اونٹ کس کل بیٹھے۔ نیہار اپنے دل میں بہت خفیف ہوا۔ اور چارے والے پر ہنسنے کا مزہ چکھا۔

(۴۳) دمڑی کا شوربہ اور چوہے کی دم

ایک افیونی تھے۔ صبح کو جوا ونگتے آنگتے آنکھیں ملتے بیدار ہوئے تو بیوی نے کہا۔ "مجھے بھوک لگ رہی ہے جاؤ بازار سے دمڑی کا شوروا لے آؤ" یہ پیالی لیکر گرتے پڑتے بھٹیارے کی دکان پر گئے۔ (بھٹیارے کے ہاں رات کو شوربے کی ہنڈیا میں چوہا گر کے مر گیا تھا)۔ بولے بھائی اس پیالی میں دمڑی کا شوروا ڈال دینا۔ اس نے چمچہ بھر شوربہ ڈال دیا۔ یہ لیکر سیدھے گھر چلے آئے۔ بیوی باسی روٹی سے جو کھانے بیٹھیں تو اس میں سے چوہے کی دم نکلی۔ بولیں میاں یہ کیسا شوروا اٹھا لائے اس میں

تو چوہے کی دم ہے۔ بولے، ابھی لے جاتا ہوں اور بھٹیارے کے منہ پر مارتا ہوں۔ پیالی لے بھٹیارے کے پاس گئے۔ کہنے لگے یہ کیا غضب ہے۔ شوربے میں چوہے کی دم ہے۔ وہ بولا میاں پھر ہوا ہی کیا۔ کیا، تم یہ چاہتے ہو کہ دمڑی کے شوربے میں ہاتھی کی دم نکلے۔ بات معقول تھی۔ میاں افیونی سن کر چپ ہو رہے اور پیالی اٹھا کر چلے آئے۔ بیوی نے پوچھا، میاں کیا ہوا۔ بولے بھٹیارا بات معقول کہتا ہے۔ وہ بولی، آخر اس موے نے کیا کہا کہنے لگے، اس نے کہا بھلا دمڑی کے شوربے میں تم ہاتھی کی دم چاہتے تھے۔ اس میں تو چوہے ہی کی دم ہوتی ہے۔ سچ تو کہتا ہے۔ بیوی بولیں، اپنے اوسان پر سے صدقہ دو، کہیں چوہے بھی پکائے جاتے ہیں۔ بولے، بیوی تو بھی سچ کہتی ہے۔ اب تو رہنے دے۔ چٹنی پیس کر کھا لے۔ ہم سے تو پھر جایا نہیں جاتا۔ دو ہی پھیرے میں ہمارا تو کچومر بن گیا۔ بیوی ان کی جان پر صبر شکر کر کے ہو بیٹھی اور کہا، کس کمبخت سے پالا پڑا ہے۔ اللہ ماں باپ کا بھلا کرے، کیسے کے پلے باندھا۔

(۴۳) دریں چہ شک (۴۳)

ایک آغا صاحب تھے۔ انھوں نے ایک بنگالے کی مینا پالی اور اس کو "دریں چہ شک" پڑھا دیا۔ وہ بالکل آغاؤں کی طرح سے بولنے لگی۔ پھر آغا صاحب ایک شہر میں گئے! اور ایک مکان کرایہ پر لیکر ساز و سامان سے خوب آراستہ کیا۔ اور یہ اڑادی کہ ایک بڑے امیر آغا کی بیگم ایران سے ہندوستان کی سیر کو آئی ہیں۔ نوکر چاکر بھی نوکر رکھ لئے۔ اور خوب امیرانہ ٹھاٹ بنا لیا۔ ایک دن مینا کے پنجرے کو پالکی میں دھر، اوپر سے طاش طامی کا پردہ ڈال، نوکر چاکروں کو وردی پہنا، ہتھیار لگا، پالکی کے ارد گرد چلنے کا حکم دیا اور خود پالکی کا پردہ تھام ساتھ ہو لئے۔ بازار میں بڑے بڑے دکانداروں کے ہاں پالکی لے گئے۔ مال دکھانے کو پالکی کے اندر کر دیتے اور قیمت بتاتے۔ اندر سے آواز آتی دریں چہ شک' کہتے مال پسند آگیا۔ ساتھ لے چلو۔ گھر جاکر قیمت ادا کردی جائیگی۔ سارے بازار میں پالکی کو نچائے نچائے پڑے پھرے، سوداگروں

کی بھیڑ کی بھیڑ مال لیکر پیچھے پیچھے ہولی۔ گھر جب آئے تو پالکی زنانہ مکان پر اتروادی۔ مال مکان میں داخل ہو گیا۔ مکان کا دوسری طرف سے راستہ تھا۔ اُدھر بار برداری تیار تھی۔ مال لاد دیا اور وہاں سے چل دیئے۔ جب سوداگروں کو بیٹھے بیٹھے آندھ آگئی تو زنانے مکان کے دروازے پر جا کر چیخے چلائے مگر وہاں کوئی ہو تو بولے آخر کار مشورہ کر کے اندر گھسے تو دیکھتے کیا ہیں، مکان خالی پڑا ہے۔ بیچ میں ایک مینا کا پنجرہ لٹکا ہوا ہے۔ جب اس کے پاس گئے تو اس نے وہی کہنا شروع کیا، دریں چہ شک، اب سمجھے بڑا دھوکا ہوا۔ مگر لالچ بری بلا ہے۔ کبیر کا دوہا ہے۔

مکھی بیٹھی شہد پر اور پنکھ دیئے پھیلائے
ہاتھ ملے اور سر کو دھنے لالچ بری بلائے

(۴۴) دیکھنا ہے منہ کس کا کالا ہوا (۴۴)

ایک فقیر صاحب تھے ان کا مقولہ تھا کہ ہر بات خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ بندوں کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ بعض اس کی

تصدیق کرتے تھے بعض تردید۔ جو تردید کرتے تھے ان میں
سے چند شہودے لچے بھی تھے۔ فقیر صاحب ایک دن بازار
میں چلے جا رہے تھے۔ ایک شخص نے پیچھے سے آکر گدّی
پر ایک چانٹا رسید کیا۔ فقیر صاحب نے مڑکر دیکھا۔ وہ بولا دیکھتا
کیا ہے، اللہ میاں نے چانٹا لگایا ہے۔ کہنے لگے، بابا یہ تو میں
جانتا ہوں مگر دیکھنا یہ ہے کہ بیچ میں کس کا منھ کالا ہوا۔

(ڈ) ڈوم کے چوتڑوں میں تیر لگا خدا جھوٹ کریگا (۷۵)

ایک ڈوم شہر کے باہر چلا جا رہا تھا۔ وہاں کچھ لوگ خاک تودہ
پر تیر اندازی کی مشق کر رہے تھے۔ اتفاق سے تیر خطا ہو کر ڈوم
کے چوتڑوں میں آن لگا۔ لوگ کہنے لگے: "ارے ڈوم رے
ڈوم تیرے چوتڑوں میں تیر لگا"۔ بولا "خدا جھوٹ کرے گا۔ خدا جھوٹ
کرے گا"۔
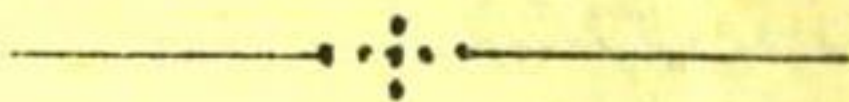
(س) سارے بنیوں کی ایک مت (۴۶)

اعلیٰ حضرت جلال الدین اکبر بادشاہ غازی وسادۂ حکومت پر خلوت خاص میں رونق افروز ہیں۔ نورتن اکبری حاضر بارگاہ ہے۔ سب صف بستہ دست بستہ شاہی مسند کے روبرو بیٹھے ہیں۔ باب گفت و شنید وا ہے۔ اثنائے کلام میں بنیوں کا ذکر چھڑ جاتا ہے۔ بیربل تو مین خدمت کو بوسہ دیکر عرض کرتا ہے کہ سارے بنیوں کی ایک مت ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ یہ ناممکن ہے ہر شخص کے قوائے دماغی مختلف ہوتے ہیں۔ اس صورت میں اختلاف رائے لازمی ہے۔ ابوالفضل اسی موضوع پر عالمانہ تقریر کرتا ہے۔ حاضرین میں سے کوئی بیربل کی تصدیق نہیں کرتا۔ بیربل ابوالفضل کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ تجربہ کر لیجئے۔ سارا حال کھل جائے گا۔ جہاں پناہ ارشاد فرماتے ہیں، تجربہ کیونکر ہونا چاہیئے۔ بیربل آداب بجا لاتا ہے اور اس طرح عرض پرداز ہوتا ہے۔ فرمان عالی شرف صدور لائے کہ محل کے خانہ باغ میں جو وسیع

حوض ہے اس کو خالی کر دیا جائے اور شہر میں ڈھنڈورا پٹوایا جائے
کہ شاہی حکم کے بموجب فلاں تاریخ ہر ایک بنیا ایک کلسہ دودھ
کا شاہی حوض میں رات کے بارہ بجے کے بعد سے صبح کاذب
تک لاکر ڈال دے۔ یہ امر ملحوظ خاطر عاطر رہے کہ شب ماہتاب
نہ ہو اور حوض کے گرد و پیش پہرا چوکی کا انتظام نہ کیا جائے۔ ارشاد
ہوا۔ ایسا ہی ہو۔ ڈھنڈورا پٹ گیا۔ بنیوں کو حکم شاہی سے آگاہی
ہوئی۔ ہر ایک نے اپنے دل میں یہ سونچا، اگر میں ایک کلسہ
پانی کا حوض میں ڈال دوں گا تو اتنے سارے دودھ میں کیا پتہ
چلے گا۔ ہر شخص نے اس خیال کو اپنے دل میں پوشیدہ رکھا۔ صبح
صادق ہوتے ہی ظلِ سبحانی حوض پر تشریف لائے۔ نورتن خاص
ہم رکاب تھا۔ ملاحظہ ہوا تو حوض میں نرا پانی ہی پانی تھا دودھ کی بوند
بھی نہ تھی۔ بیربل نے دست بستہ عرض کیا کہ فدوی کی بات ٹھیک
ثابت ہوئی۔ ابوالفضل کے فلسفہ کی کرکری ہوگئی۔

ساری سوئیاں نکالیں آنکھوں کی سوئیاں رہ گئیں بیوی تھی سو لونڈی بن گئی لونڈی تھی بیوی بن گئی

ایک بادشاہ تھا۔ ہمارا تمھارا خدا بادشاہ خدا کا بنایا رسول بادشاہ اور اس کی ایک اکلوتی لڑکی گھر بھر کا اجالا۔ ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھی۔ باپ پل بھر بھی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتا۔ ماں بیٹی کو دیکھکر جیتی۔ اور ہر وقت صدقہ قربان جاتی۔ خدا سے دعا کرتی کہ اس کا بال بیکا نہ ہو۔ اس کی بلا مجھ پر آجائے اور یہ بے بلا رہے۔ جب تک بچہ رہی انا دوا کھلائی تخت شاہی کے پاس کھلایا کرتی تھیں۔ باپ دربار بھی کرتا جاتا تھا اور بیٹی سے بھی دل بہلاتا رہتا تھا۔ جب خدا نے اس کو پروان چڑھایا تو مردانہ کپڑے پہنا بادشاہ سیر و شکار میں ساتھ رکھنے لگا۔ خود سایہ کی طرح ساتھ رہتا اور اس کو نظروں میں رکھتا۔ ایک روز بادشاہ کا دل صید افگنی پر مائل ہوا۔ شاہی کارخانے تھا خیال کا آنا تھا کہ سیر و شکار کا سامان۔ میر شکار نے تیار کر دیا۔ گھوڑوں پر

سوار ہوا میر وزیروں کو ساتھ لے جنگل میں جا پہنچا۔ ایک چٹان پر
کالا نظر پڑا۔ ٹاپوں کی آہٹ پاکر گردن اُٹھا کر دیکھا اور ایک قلانچہ
بھر یہ جا وہ جا۔ بادشاہ اور شاہزادی نے اس کے پیچھے گھوڑے
ڈال دیئے۔ ہرن نظر پڑتا ہے اور پھر غائب ایک جھلک دکھاتا
ہے اور پھر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا۔ یہ باپ بیٹی گھوڑے
دبائے چلے جا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک سیاہ آندھی اُٹھی
دنیا اندھیر ہو گئی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں
دیتا۔ یہ ایک دوسرے کو آواز دیتے۔ سر بہ صحرا خدا پر بھروسہ کئے
چلے جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد اندھیا ؤ کھلا۔ اور کچھ کچھ روشنی
ہونی شروع ہوئی۔ تو کیا دیکھتے ہیں ایک عالی شان دروازے
کے سامنے کھڑے ہیں اور وہ ہرن بھی سامنے موجود ہے۔ ان
کو دیکھ ایک جست مار دروازے کے اندر چلا گیا۔ شاہزادی
نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ہرن کے پیچھے چلی۔ پیچھے پیچھے
باپ بھی آیا۔ اتنے میں ایک گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی اور
دروازہ بند ہو گیا۔ اب باپ دروازے کے اس طرف کھڑا ہے

اور بیٹی اس طرف ، لاکھ دروازے کو ہلاتا ہے ، زور لگاتا ہے ، پر وہ فولادی درلٹس سے مس نہیں ہوتا۔ شاہزادی اندر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پر کنڈی نہ کھٹکا۔ چٹخنی نہ آگل ، کھولے تو کس چیز کو کھولے۔ عجب طلسمی دروازہ ہے کہ اس کے کھولنے کی کوئی شکل نہ بند کرنے کی کوئی تدبیر۔ اس حصار کے چاروں طرف جا کر دیکھا۔ سر بہ فلک دیواریں پائیں۔ بس درآمد و برآمد کی اگر کوئی راہ ہے تو وہی ایک دروازہ جو بند پڑا ہے۔ اتنے میں شام ہو گئی۔ آفتاب غروب ہوا چاہتا ہے۔ بیٹی نے باپ سے کہا۔ سلطنت کا معاملہ ہے۔ آپ کو اگر جانے میں دیر ہوئی تو ہزار قسم کے اندیشے ہیں۔ میری بات مانئے مجھے خدا کے حوالے کیجیے اور آپ گھر جائیے۔ اماں جان پریشان ہوں گی۔ باپ نے کہا تیری ماں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ تجھے پوچھے گی تو کیا بتاؤں گا۔ میں تو اسی دروازے کے باہر دھونی رما کر بیٹھ جاتا ہوں۔ یا قسمت یا نصیب۔ بیٹی نے کہا آپ کیا باتیں کرتے ہیں۔ ایک میں ہی آپ کی اولاد تھوڑی ہوں۔ آپ ساری رعایا

کے ماں باپ ہیں۔ آپ کے سوا ان کا کون سر دھرا ہے۔ اماں
ہم دونوں کی جدائی ایک وقت میں کیونکر برداشت کر سکیں گی۔
خدا نخواستہ دیوانی ہو جائیں گی۔ جب آپ کو اور مجھ کو نہ پائیں گی،
دیواروں سے سر پھوڑ پھوڑ کر مر جائیں گی۔ آپ جائیے ان
کی دلجوئی کیجئے۔ سلطنت کا کام سنبھالیئے۔ مجھے خدا کے بھروسہ
پر چھوڑ دیئے۔ آپ اکیلے یہاں کر بھی کیا سکتے ہیں۔ اپنے راج
پاٹ میں جا کر میری رہائی کی بھی سو تدبیریں ہو سکتی ہیں۔" باپ افتاں
وخیزاں با دل ناخواستہ بیٹی کو وہاں چھوڑ چل کھڑا ہوا۔ امیر وزیر بادشاہ
اور شاہزادی کو تلاش کرتے کرتے ہلکان ہو گئے تھے۔ اب کھڑے
آپس میں مشورہ کر رہے تھے کہ رات یہیں گزاریں، صبح پھر تلاش
شروع کریں یا شہر واپس جائیں کہ دور سے بادشاہ کی صورت
نظر پڑی، جان میں جان آئی۔ پر بادشاہ اکیلا آتا نظر آیا، سمجھے شاہزادی
پیچھے آ رہی ہوں گی۔ خیر مقدم کو آگے بڑھے تو دیکھا بادشاہ کا
عجب حال عجب احوال ہے۔ آنکھوں سے آنسو کے دریا
جاری ہیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں۔ چھاگل میں سے پانی دیا

دریافت کیا شاہزادی کہاں ہیں۔ بس یہ نام آتے ہی۔ دل میں ایک تلاطم بپا ہو گیا۔ آنسوؤں کا سمندر امنڈ آیا۔ کہا ساری عمر کی کمائی کو کھو آیا ہوں۔ اب میں رونے اور ماتم کرنے کو زندہ ہوں۔ اُس طلسمی دروازہ کا سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اور اپنی سلطنت کی طرف روانہ ہوا۔ امیر اور وزیر سکتہ کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں۔ منہ سے کسی کے ایک لفظ نہیں نکلتا۔ زبانیں بند ہو گئی ہیں۔ دل پر درد آہ سرد کے ساتھ اپنے سردار کے پیچھے ہو لئے۔ محل میں کہرام مچ گیا۔ راج دھانی میں سوگ منایا گیا بادشاہ سیاہ پوش ہوا۔

اب یہاں کی داستان تو یہاں چھوڑیئے۔ دیکھیں وہاں شاہزادی پر کیا بیتی۔ باپ کو سمجھا بجھا کر تو رخصت کر دیا۔ پھر جو اس کے دل پر بنی وہ خدا دشمن پر بھی نہ بنائے۔ نازوں کی پالی شاہزادی تن تنہا باغ میں کھڑی ہے۔ تھر تھر کانپ رہی ہے۔ کل موی رات سر پر چڑھی چلی آ رہی ہے۔ قدم اٹھتا نہیں۔ ڈر کے مارے دم پر بنی ہوئی ہے۔ ذرا سی آہٹ پر اچھل پڑتی ہے۔ پر انسان پر جیسی پڑتی ہے

ویسی سہتا ہے۔ اللہ کا نام لے آگے بڑھی۔ ایک سنگِ مرمر کی بارہ دری نظر آئی۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ خیر سر پر چھت تو ہے۔ اندر گھسی تو آراستہ و پیراستہ سجی سجائی۔ دل میں سونچا خدایا یہ کیا طلسم ہے۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ سامان سب قرینہ سے رکھا ہوا۔ ایک جگہ پہنچی تو مسہری پر ایک آدمی نظر آیا۔ سہم کر رہ گئی۔ کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ عورت ذات، غیر مرد، اکیلی جگہ، ایک طرف کھڑی ہو کر سونچنے لگی کہ کروں تو کیا کروں۔ پھر آگے بڑھکر دیکھا تو وہ مردِ خدا جیسے پڑا تھا بے حس و حرکت اسی طرح پڑا ہے۔ جنبش تک نہیں۔ سونچا یہ مردہ ہے یا زندہ۔ دل کڑا کر کے آہستہ آہستہ دبے پاؤں آگے بڑھی دیکھا ایک حسین نوجوان پڑا سو رہا ہے۔ پر سانس کی سرسراہٹ تک نہیں۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ عجیب سوئیوں میں بندھا پڑا ہے کسی بیری نے سارا بدن چھلنی کر رکھا ہے۔ یہ شکل دیکھ شاہزادی اپنا غم بھول گئی۔ اس حسین کی مصیبت پر آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس مصیبت زدہ کے پاس ہو بیٹھی۔ دل میں سونچا کہ دنیا کیسی کیسی مصیبت میں ہے۔ جب اندھیرا ہو گیا، شمع جلائی اور

اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔ سوچا خالی بیٹھے بیٹھے کیا بڑھوں گی، لاؤ اس کی سوئیاں ہی نکالوں۔ کیا عجب ہے کہ خدا اس کو زندہ کردے اب شاہزادی کا یہ معمول ہوگیا۔ دن بھر اس کی سوئیاں نکالے جب بھوک لگے باغ میں سے میوہ توڑ کر کھائے اور رات کو شاہزادہ کی مسہری کے قریب پڑ کر سوجائے۔ پہلے اس کی مصیبت پر ترس آیا تھا پھر طبیعت مانوس ہو چلی اور اب محبت نے دل میں گھر کرلیا۔ ایک روز شاہزادی بیٹھی سوئیاں نکال رہی تھی کہ اس کو باغ کے باہر سے انسان کی آواز سنائی دی۔ اس نے لپک کر چھت پر سے دیکھا تو ایک عورت ہار بیچ رہی تھی آواز دی اور دیوار کے نیچے بلا لیا۔ کمند ڈال اوپر کھینچا۔ شاہزادی سوئیاں نکالنے میں ایسی رندھی ہوئی تھی کہ اپنے سر منہ کا کچھ ہوش نہ تھا۔ تمام بدن کی سوئیاں نکال چکی تھی۔ صرف آنکھوں کی سوئیاں رہ گئیں تھیں۔ سوچا اب یہ سوئیاں نکال لوں گی۔ جادو ٹوٹ جائے گا۔ اس کی ٹوٹی جڑ جائے گی۔ خدا اسے زندہ کردے گا۔ آنکھیں کھول کر مجھے دیکھے گا سر جھاڑ منہ پہاڑ پائے گا۔ کیا دل میں کہے گا۔ بہتر ہے کہ پہلے

نہا دھو کپڑے بدل لوں۔ پھر آنکھوں کی سوئیاں نکالوں گی۔ اس آفت رسیدہ ہاروالی کو پاس بٹھا خود نہانے چلی گئی اور تاکید کر گئی کہ مکھیاں اڑاتی رہیو۔ میں دم کے دم میں آئی۔ اس آفت کی پرکالہ نے یہ آفت ڈھائی کہ بیٹھے بیٹھے آنکھوں کی سوئیاں نکالنی شروع کر دیں۔ جب آخری سوئی نکل گئی تو وہ کلمہ پڑھ اُٹھ بیٹھا۔ اس عورت کے قدم پکڑ لئے اور کہا تم نے میری جان بچائی ہے۔ تادم واپسیں یہ احسان نہ بھولوں گا۔ اب شاہزادی نہا دھو کر آئی تو یہاں رنگ بدلا ہوا پایا۔ وہ عورت ڈلا اس پر اپنا رنگ جما چکی تھی۔ شاہزادی کو لونڈی بنا چکی تھی۔ وہ شخص جو سوئیوں میں بندھا پڑا تھا کسی دیس کا شاہزادہ تھا۔ سوتیلی ماں کے ہاتھوں اس دہاڑے کو پہنچا تھا۔ اس ڈلا نے شاہزادی کو کوّے ہنکنی بنا ٹاٹ کے کپڑے پہنا، مونجھ کی ٹوپی اڑھا، محل کی چھت پر بٹھا دیا۔ کہ دن رات کوّے اڑایا کرے اور خود راج راجنے لگی۔ شاہزادہ سامان سفر تیار کر سیر و سیاحت کے لئے نکلا۔ محل میں سب سے سونا لوں کی بابت پوچھا۔ کسی نے کچھ بتایا کسی نے کچھ۔ چلتے چلتے خیال آیا کہ

چلو اس کوّے ہنکنی سے بھی پوچھ لیں۔ وہ بھی کچھ منگوائے تو لیتے آئینگے
کوّے ہنکنی سے دریافت کیا گیا تو اس نے کہا شاہزادے سے
کہدو کہ اگر کہیں سوہن گڑیوں کا صندوقچہ ملے تو لیتے آئیے۔ جہاز
نے لنگر اٹھایا۔ شاہزادہ روانہ ہو گیا۔ جہاں جہاں گیا سوہن گڑیوں
کا صندوقچہ تلاش کیا۔ دنیا چھان ماری پر کہیں نہ ملا۔ ہر شہر و دیار میں
پوچھا پتہ نہ پایا۔ آخر کار شاہزادے نے واپسی کی ٹھانی اور جہاز پر
سوار ہوا۔ لنگر اُٹھایا۔ بادبان ہوا کے رخ پر پھیلائے گئے۔ پر جہاز
اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ ملاح ایک دوسرے کی شکل
دیکھ رہے ہیں۔ ناخدا حیران پریشان کہ ماجرا ہے تو کیا ہے۔ سب
ہمراہیوں کو شاہزادے نے مشورت کے واسطے جمع کیا۔ ایک
پیر سال خوردہ نے دست بستہ عرض کی کہ کسی کی فرمائش آپ لینی
بھول گئے ہیں۔ اس وجہ سے جہاز جنبش نہیں کھاتا اور جب تک
وہ چیز نہ آجائے گی ممکن نہیں کہ جہاز اپنی جگہ سے ہل جائے۔ فرمائشوں
کی فہرستیں دیکھی گئیں تو معلوم ہوا کہ کوّے ہنکنی کا سوہن گڑیوں کا صندوقچہ
رہ گیا ہے۔ شاہزادے نے پیک دوڑادئے کہ جہاں کہیں بھی

ہو لیکر آؤ۔ کہ کسی طرح نجات ملے۔ وطن پہنچیں۔ شدہ شدہ ایک مصاحب
اس شاہزادی کے باپ کے شہر میں جا نکلا وہاں دریافت کرنے
سے معلوم ہوا کہ بیشک سوہن گڑیوں کا صندوقچہ ہے تو سہی پر بادشاہ
سلامت کے پاس ہے۔ دربار میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ وہ بیٹی کے غم
میں روتے روتے اندھا ہو گیا تھا۔ کہا ئے جاؤ مجھے اس کو آب کیا
آگ لگانی ہے جب وہ کھیلنے والی ہی نہ رہی تو کھلونوں کو رکھ کر کیا
کروں گا۔ قیمت ویمت ہم کو نہیں چاہیئے۔ شاید خدا کا کرنا ایسا ہو کہ یہ
صندوقچہ اگر میری بیٹی زندہ ہو تو اس تک پہنچ جائے اور جو وہ اپنے
خدا کے ہاں چلی گئی ہو تو اسے ثواب مل جائے گا۔ اور ہم بھی ایک
دن اس سے وہیں جا ملیں گے۔ اس صندوقچہ کا جہاز پر پہنچنا تھا کہ
جہاز چل پڑا۔ گھنٹوں کی منزل منٹوں میں اور سالوں کا سفر دلوں میں
طے کرتا منزل مقصود پر جا پہنچا۔ سب کی سوغاتیں تقسیم ہوئیں۔ کوّے
ہنکنی کا صندوقچہ اُسے دیدیا گیا۔ اب شاہزادی کا یہ معمول ہو گیا کہ روز
رات کو آدھی رات اِدھر آدھی رات اُدھر سوئے سنسار جاگے
پاک پروردگار یہ اٹھتی تھی اور محل کے قریب جنگل میں جا کر وہ صندوقچہ

کھولتی بجتی جادو کی گڑیوں کا تھا جو اس کے باپ نے اس
کے لئے پرستان سے منگوایا تھا۔ اس کے کھولتے ہی جاروب
کش نکلتا۔ جھاڑو بہارو دیکر سارا میدان چندن سا نکال دیتا۔ سقہ
عطراور گلاب کا چھڑکاؤ کرتا۔ فراش فرش کرتا، محفل آراستہ ہوتی
شاہزادی نہا دھو، بن سنور، تخت پر بیٹھتی، گڑیوں سے کھیلتی، دو گھڑی دل
بہلاتی۔ صبح ہوتے سب گڑیاں مل کر کہتیں "سب سوئیاں
نکالیں۔ آنکھوں کی سوئیاں رہ گئیں لونڈی تھی سو بیوی بنی اور بیوی
تھی سو لونڈی بنی۔" خدا کا کرنا ایسا ہوا۔ کہ شاہزادے کی ایک رات
آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا کیا ہے کہ محل کے قریب جنگل میں منگل ہو رہا
ہے۔ خوشبوؤں کی لپٹیں چلی آرہی ہیں۔ روشنی سے میدان بقعۂ نور بنا
ہوا ہے۔ دل میں سوچا کہ راجہ اندر کا اکھاڑہ آن اُترا ہے یا پریوں
کی محفل ہے۔ پلنگ پر سے اُٹھ کر اس طرف روانہ ہوا۔ عجب طلسمی
کارخانہ نظر پڑا۔ ایک درخت کے پیچھے سے ساری سیر دیکھی۔ صبح
ہوتے جب کوّے ہنکنے صندوقچہ بند کرنے لگی تو سوہن گڑیوں نے
جو روز فقرہ کہتی تھیں وہ دہرایا۔ اب شاہزادہ سارا معاملہ سمجھ گیا۔ کوّے

ھنکنی ٹاٹ کے کپڑے پہن محل کی طرف چلی۔ شاہزادے نے آگے بڑھ ہاتھ پکڑلیا۔ شاہزادی کے چہرے پر مردنی چھاگئی۔ کاٹو تو لہو نہیں۔ یہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی اور بید کی طرح کانپنے لگی۔ شاہزادے نے کہا ڈر نہیں۔ مجھ کو سارا معاملہ بتا۔ غریب آفت زدہ نے از سرنو سارا ماجرا سنایا۔ اس نے اسے اپنے خیال کے موافق پایا۔ شاہزادہ غصہ میں لال پیلا ہوگیا۔ اس ڈلا کو آدھا زمین میں گڑوایا اور بھوتے تیروں اڑوادیا۔ شاہزادی کے خدانے دن پھیرے اپنے ماں باپ سے جاملی۔ خدانے باپ کی آنکھوں میں روشنی دی نور نظر کو دیکھا۔ شادان وفرحاں بسر کرنے لگا۔ جیسے ان سب کا بھلا ہوا اللہ کہنے اور سننے والوں کا بھلا کرے۔

(۴۷) سیکھ واکو دیجئے جاکو سیکھ سہائے
سیکھ نہ دیجے باندرا بیا کا گھر بھی جائے

کوڑیا کال جاڑا پڑ رہا تھا۔ ہوا ایسی سرد تھی کہ سینہ کے پار ہوئی

جاتی تھی۔ سارے جاندار سکڑے سکڑائے اپنے اپنے کونے میں بیٹھے تھے۔ درخت کی ایک ڈالی پر میاں بندر سردی کے مارے ٹھٹھر رہے تھے۔ ان کے سر پر بیا کا گھونسلا لٹک رہا تھا۔ تم نے اگر اس کا گھونسلا دیکھا ہوگا تو سمجھ جاؤ گے کہ کیسے آرام کا ہوتا ہے اس کے اندر ہوا دھوپ اور مینھ کا گزر تک نہیں ہوتا۔ بیا آرام سے اپنے گھر میں گرم بیٹھا تھا۔ بندر کو سردی کی تکلیف پاتے ہوئے دیکھکر اس کو رحم آیا۔ گھونسلے میں سے منھ نکال کر کہنے لگا۔ میاں بندر تم بڑے بیوقوف ہو۔ اگر آج کو تم بھی میری طرح گھونسلا بنا لیتے تو کیوں سردی کے دُکھ پاتے۔ بندر تو پہلے ہی سے سردی کے مارے بدمزاج ہو رہا تھا۔ طیش میں آگیا۔ ایک چھلانگ مار بیٹے کے گھونسلے پر جا پہنچا۔ اس کو نوچ کھسوٹ بتّی بتّی کر ڈالا۔ بیا وہاں سے حیران و پریشان اپنے کو لعنت ملامت کرتا ہوا اُڑ گیا۔ اب بیا درخت پر بیٹھا سردی کھا رہا ہے اور بندر کی جان کو دعا دیتا ہے

(۴۸) سخن فہمی عالم بالا معلوم شد (۴۸)

پڑھے لکھے اس مثل کو بولتے ہیں جاہلوں کی زبان پر نہیں ہے۔ قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب سعدی علیہ الرحمتہ نے یہ شعر فرمایا۔

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار   ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

تو آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر دیکھا۔ عالم بالا سے ایک نور کا طبق نازل ہوا۔ میاں فیضی کا بھی یہ قصہ سنا ہوا تھا۔ اُنھوں نے یہ شعر موزوں کیا

ہر گیاہے کہ از زمین روید   وحدہٗ لاشریک لہ گوید

اپنے شعر پر بڑا ناز ہوا۔ اور یہ خیال کیا کہ سعدی کے شعر سے بھی میرا شعر بڑھ گیا۔ اُمیدوار ہوئے کہ آسمان سے طبق نور نازل ہو صحن خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر دیکھا۔ وہاں کیا ہونا تھا۔ کوے چیل اُڑے جا رہے تھے کسی نے بیٹ کر دی۔ وہ میاں کے منہ پر پڑی۔ بہت غصے ہوئے اور فرمانے لگے "سخن فہمی عالم بالا معلوم شد"

مثل (۴۹)

شیطان کا لاسہ

راستہ پر تھا کھڑا اک پیر مردِ متقی
جس کی صورت سے شرافت اور نجابت تھی عیاں
اہلِ دل اس کو سمجھکر ایک نے بعد از سلام
عرض کی اسمِ مبارک کیجئے اپنا بیاں
بولا وہ ابلیس ہوں میں۔ اور یہ دنیا کے لوگ
میری سب وشتم سے آلودہ کرتے ہیں زباں
تنگ ہوں میں زلیست سے پر آنی مر سکتا نہیں
جھیلتا ہوں ان کے ہاتھوں میں نہایت سختیاں
میری صورت کو بگاڑیں۔ میری سیرت کو مٹیں
گو کہ ان عیبوں سے میں بالکل بری ہوں بے گماں
کام خود اپنا بگاڑیں اور کریں لعنت مجھے
خود زبوں کاری کریں ناحق مجھے دیں گالیاں
اہلِ دل کو اب وہ سمجھا کون تھے ذاتِ شریف
جا کے حلوائی کے ہاں شیرے میں بھر لیں انگلیاں

آنکر اس نے لگادیں انگلیاں دیوار کو
اور یوں کہنے لگا دیکھا بھی تم نے کچھ میاں
کام جو میں نے کیا ہے ہے وہ اک فعلِ عبث
تم ہی کہدو کچھ برائی اس میں پاتے ہو نہاں
یہ تو تھے اس گفتگو میں اور شیرہ پر وہاں
ایک دم بھر میں اکٹھی ہو گئیں کچھ مکھیاں
دیکھ کر ان مکھیوں کو چھپکلی بھی آ گئی
تاکہ حاصل ہو کچھ ان سے لذتِ کام دہاں
دیکھتے ہی چھپکلی کو بی میاؤں چل پڑیں
دیر تھی بس دو چھلانگوں کی کہ جا دھمکیں وہاں
اتنے ہی میں جا رہے تھے اس طرف سے لشکری
ساتھ جن کے ایک کتا تھا نہایت نیم جاں
دیکھ کر بلّی کو کتے نے کیا قصدِ شکار
اور ہوا راہی اُدھر کو بلّی دبکی تھی جہاں
دیکھ کر کتے کو بلّی کے تو چھکے چھٹ گئے
دوڑ کر دھم سے گری اک دیگداں کے درمیاں

جان بلی کی گئی شیرہ ہوا برباد سب
طیش میں حلوائی آیا دیکھ کر اپنا زیاں
ایک لٹھیا ٹانٹ پر کتے کے دی اس زور سے
جس کے صدمہ سے نہ جانبر ہوسکا یہ بے زباں
دیکھ کر یہ ماجرا غصّہ میں آئے لشکری
جنگ پھر ہونے لگی اسکے اور ان کے درمیاں
فوج تھی سب اس طرف بازار سارا اس طرف
لاٹھی پونگا وہ بجا کہ الحفیظ و الاماں
اک ذرا سی بات کا کیسا بتنگڑا بن گیا
خون کی بہنے لگیں ساری سڑک پر ندیاں
کام یاں شیطان کے بنتے ہیں یارو اس طرح
پاس تم اس کے نہ جانا اس سے رہنا بر کراں
اس کے لاسہ سے بشر دم بھر بھی بچ سکتا نہیں
گر نہ اس کے ساتھ ہو فضل خدائے مہرباں

(۵۰) شوربا حلال بوٹی حرام (۵۰)

ایک صاحب تھے۔ نماز روزے کے پابند۔ بڑے متقی
ان کی ایک بہن صاحبہ تھیں۔ انھوں نے عیسائی مذہب اختیار
کرکے کسی انگریز سے نکاح کرلیا تھا۔ یہ کبھی کبھی بہن کے پاس ہو آتے
تھے ایک دن بہن نے بھائی کی دعوت کردی۔ یہ بدلِ ناخواستہ
گئے کھانا جو سامنے آیا۔ اس میں قورمہ بھی تھا۔ انھوں نے شوربے
سے روٹی لگا لگا کر کھالی۔ مگر بوٹی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ جب یاروں
میں بیٹھے تو کہنے لگے۔ آج بڑا غضب ہو جاتا۔ بہن نے میری
دعوت کردی تھی جانا ہی پڑا۔ تمھیں معلوم ہے وہ کمبخت کرسٹان
ہوگئی۔ مجھے یہ ڈر ہوا کہ کہیں سور پکا کر مجھے نہ کھلادے۔ مگر خدا
نے بڑی خیر کی۔ یاروں نے کہا تو بھائی پھر تم نے کیا کیا۔ کہنے لگے
وہاں قورمہ تھا۔ میں نے شوربے سے روٹی لگا لگا کر کھالی۔ اور
بوٹی کو چھوا تک نہیں۔ یاروں نے کہا واہ بھائی بڑی ہوشیاری کی
"سور کا شوربا حلال اور بوٹی حرام یہ تمھارا ہی مسئلہ ہے"

قاضی عدّو

ق ۵۱

ایک صاحب کا نام قاضی عدّو تھا۔ تم جانتے ہو عدّو کس کا
نام ہوتا ہے۔ بھائی جو عید کے دن پیدا ہو تو گنوار اس کا نام
کبھی کبھی عدّو رکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح جو جمعہ کے دن پیدا ہوتا
ہے وہ جمعہ ہو جاتا ہے۔ شاید یہ صاحب عید کے دن پیدا
ہوئے ہوں گے۔ ان کو کسی تدبیر سے ایک عمل ہاتھ آگیا جب
قبر پر کھڑے ہو کر پڑھتے تو مردہ قبر کے باہر نکل آتا۔ اور
اپنا کفن اُتار کر ان کے حوالہ کر دیتا۔ پھر قبر میں داخل ہو جاتا۔ قبر
جیسی تھی ویسی ہی ہو جاتی۔ یہ کفن بیچ کر اپنی گزران کرتے تھے۔ کسی
شخص کو اس کا پتہ چل گیا۔ ایک دن وہ چپکے چپکے دبے پیروں
ان کے پیچھے لگ لیا۔ یہ رات کے ادھی بجے قبرستان میں
جا پہنچے۔ اور قبر پر کھڑے ہو کر عمل پڑھا۔ اس شخص نے چھپ کر
عمل کے الفاظ سیکھ لئے اور وہاں سے کھسک گیا۔ مگر چوک یہ
ہو گئی کہ وہ پھر کچھ الفاظ کہتے تھے جب مردہ دوبارہ قبر میں داخل

ہوتا تھا۔ اور قبر یکساں ہو جاتی تھی۔ اب یہ نوسیکھڑا اس تاک
میں رہا کہ کوئی مرے تو عمل کے اثر کو آزمائے۔ دن میں دو
دو تین تین پھیرے قبرستان کے مارتا۔ مگر کمبخت کوئی مردہ ہی وہاں
نہ آتا۔ خدا خدا کر کے ایک دن جو قبرستان میں گیا تو دیکھا کہ میت
دفن ہو رہی ہے۔ الٹے پاؤں واپس چلا آیا۔ اور دل میں خوش
ہوا کہ آج کام بن جائے گا۔ رات کے اندھیرے میں وہاں جا پہنچا
عمل پڑھا مردہ باہر نکلا اور کفن دیدیا۔ مگر اب کسی عنوان وہ قبر میں
نہیں جاتا۔ یہ لاچار ہو کر بستی کی طرف روانہ ہوا۔ مردہ ننگا دھڑنگا اس
کے پیچھے پیچھے لگا چلا آرہا ہے۔ اگر یہ بھاگتا ہے تو وہ بھی بھاگتا
ہے۔ جو یہ آہستہ چلتا ہے تو وہ بھی آہستہ پیچھے پیچھے ہے۔
غرض اس کی جان نہیں چھوڑتا۔ دم ناک میں آگیا۔ سوچا کہ قاضی
عدو کے گھر چلو۔ بس ان کو ہی یہ عمل یاد ہے وہی اس بلا کو ٹالیں گے
اس بھاگ دوڑ میں صبح قریب آن لگی۔ قاضی عدو کے گھر پہنچا نام
لیکر آواز دی۔ گھر میں سے کوئی بولا کہ قاضی عدو کا تو کل انتقال ہو گیا
تم کیا چاہتے ہو۔ بس اس کا دم ہی تو نکل گیا۔ اتنے میں جھٹپٹا سا

ہو گیا۔ مڑکے دیکھتا ہے تو جو صاحب پیچھے پیچھے ساتھ ہیں وہ خود
قاضی عِدّو ہی ہیں۔ لاکھ ان کی منّت سماجت کی۔ ہاتھ پاؤں جوڑے
خدا کا واسطہ دلایا۔ کہا بھائی معاف کردو اب کبھی مجھ سے ایسی خطا
نہیں ہو گی۔ للّٰلہ قبر میں چلے جاؤ۔ میری جان چھوڑو۔ مگر وہاں ایک
چپ سو کو ہرائے۔ عاجز آکر گلی کے نکڑ پر ایک پتھر پر جا بیٹھا۔ بغل
میں کفن دبا ہوا ہے۔ قاضی عِدّو مادر زاد ننگے سامنے کھڑے ہیں۔
اتنے میں خوب اُجالا ہو گیا۔ آدمی جمع ہو گئے۔ قاضی عِدّو کو سارا
شہر جانتا تھا۔ سب نے پہچان لیا۔ اس سے پوچھا کہ بھائی آخر ماجرا
کیا ہے۔ اس نے سارا قصّہ کہہ سنایا۔ سب نے بھی قاضی صاحب
کو بہت سمجھایا اور کہا اس غریب کے حال پر رحم کھاؤ۔ اب جانے
بھی دو۔ معاف کردو۔ یہ پھر کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ مگر قاضی صاحب
تو ایک چلتے پھرتے پتلے تھے۔ بولنے کی طاقت کہاں تھی۔ ان
میں ایک شخص کچھ عقلمند تھا اس نے کہا۔ اب کوئی تدبیر نہیں۔ ان
دونوں کو قبرستان لے چلو اور قبر میں اتار دو جب وہاں پہنچے اور یہ قبر میں
لیٹ گیا تو قاضی عِدّو بھی پاس ہو لیٹے۔ مجبوراً دونوں پر مٹّی ڈال دفن کر چلے آئے

ک کنواں بیچا کنویں کا پانی نہیں بیچا (۵۲)

ایک صاحب کشمیری تھے اور چال بازی میں فرد۔ ان کی ملکیت
سے ایک کنواں تھا اس کو کسی کے ہاتھ بیچ ڈالا ٹکے گنوا لئے
اُنھوں نے کنواں ثواب کی خاطر خریدا تھا۔ لوگ پانی پئیں گے
آرام اُٹھائیں گے۔ اللہ اس کا مجھ کو اجر دے گا۔ مگر دوسرے دن
کیا دیکھتے ہیں کہ کشمیری صاحب کنویں کی مینڈھ پر جیر سے چڑھے
بیٹھے ہیں۔ اور کسی کو پانی بھرنے نہیں دیتے۔ ان سے کہا بھائی
تو نے یہ کیا تماشا کر رکھا ہے۔ تم کو قیمت مل گئی اب اس کنویں
پر تمھارا کیا اجارا ہے۔ میں نے اللہ راہ پر مول لیا ہے۔ میں تو
سب کو پانی بھرنے دوں گا۔ بولے صاحب جایئے اپنا قبالہ
دیکھئے۔ پھر آکر مجھ سے بات کیجئے گا۔ میں نے کنواں بیچا ہے۔
کنویں کا پانی نہیں بیچا۔ قبالہ میں یہی لکھوایا ہے۔ جس کو چاہوں گا۔
پانی لینے دوں گا۔ جس کو چاہوں گا روک دوں گا۔ آپ کا کچھ
اختیار نہیں۔ یہ بہت پریشان ہوئے دل میں کہا بیشک لکھا ہوا

تو یہی ہے۔ اب میں کیا کروں خیال آیا کہ ایک ہمارے یار بھی تو کشمیری ہیں۔ چلو ان سے مشورہ کریں۔ وہاں گئے اور ساری حقیقت بیان کی۔ وہ بولے "اگر میں اس مردود کو نکال باہر کروں تو یار کیا دلواؤ گے۔ اس نے کہا بھائی میں نے تو کنواں اللہ واسطے لیا ہے تم کو بھی اس کام کا ثواب ملے گا۔ بولے بھائی ہم ثواب عذاب کچھ نہیں جانتے۔ ہم تو پیٹ کے بندے ہیں۔ کچھ قبولو تو تمھارا کام کر دیں۔ انھوں نے کہا اچھا بھائی تم بھی دس پانچ روپے لے لینا بہت اچھا اب گھر چلو۔ ہم کو قبالہ دکھاؤ۔ دونوں گھر آئے اور قبالہ دیکھا اس میں کنوئیں کے اردگرد کی زمین بھی گئی گز ان کے نام لکھی ہوئی تھی۔ بولے بھائی مار لیا۔ اب قبالہ لیکر میرے ساتھ کنوئیں پر چلو۔ میں اس کو قائل معقول کر کے نکال دوں گا۔ دونوں ساتھ ساتھ کنوئیں پر آئے۔ ایک کشمیری سے دوسرے کشمیری نے فرمایا۔ بھائی آخر جھگڑا کیا ہے اس نے کہا جھگڑا کچھ بھی نہیں۔ میں نے کنواں بیچا ہے۔ کنوئیں کا پانی نہیں بیچا۔ پانی پر مجھے مالکانہ تصرف حاصل ہے۔ جس کو چاہوں لینے دوں جسے چاہوں نہ لینے دوں۔ قبالہ دیکھ لو اور اپنا اطمینان کر لو۔ بولے

بھائی یہ تو تم سچ کہتے ہو۔ قبالہ میں یونہی ہے۔ مگر یہ کنواں تو انھوں نے
ثواب کی خاطر لیا ہے۔ آدمیوں کو پانی بھرنے دو تم کو بھی ثواب ہوگا
اور اس ضد کو جانے دو۔ بولا بھائی ہم ثواب عذاب کچھ نہیں جانتے
ہم تو حق پر اڑے رہتے ہیں۔ بس قبالہ دیکھ لو اور اپنی راہ لو کشمیری
بولا۔ قبالہ میرے پاس ہے۔ مگر دیکھو بھائی جانے بھی دو۔ یہ جھگڑا اچھا
نہیں دو چار روپے ان سے اور لے لو اور پیچھا چھوڑ دو۔ بولا بھائی
یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ میں تو اپنا حق لوں گا۔ اچھا تو لے بھائی حق ہی لے
قبالہ دیکھ۔ تو نے کنویں کے گرد و پیش کی زمین بیچ ڈالی ہے۔ اب یہ
زمین ہماری ملکیت ہے۔ ہم تجھ کو اس پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں
دیتے۔ یہاں سے فوراً چلا جا اور اپنا پانی اپنے ساتھ لے جا۔ نہیں
تو جتنے دن تیرا پانی کنویں میں رہے گا کرایہ دھروالیں گے۔ اب
تو یہ سٹ پٹایا کہ اُلٹی آنتیں گلے پڑیں۔ بولا اچھا بھائی چلا جاتا ہوں
پانی کا کیا ہے یہ تو سب خدا کا ہے۔ پر اتنا بتا دو کہ آپ کون ہیں
یہ بولے بھائی جو تو ہے سو ہم ہیں۔ تو بھی کاشو بھائی ہم بھی کاشو بھائی
بولا بھائی ٹھیک ہے۔ ایسے نکتے کشمیری دماغ ہی نکال سکتا ہے

(۵۴) کمبل نے پکڑ لیا (۵۴)

ایک گروجی اپنے چیلے چانٹوں کو لئے دریا کنارے بیٹھے تھے۔ دور سے ایک کالی کالی چیز تیرتی ہوئی نظر آئی۔ ایک چیلے نے کہا گروجی کمبل بہتا چلا آرہا ہے۔ کہو تو نکال لاؤں۔ گروجی نے کہا بچہ جا نکال لا۔ لنگوٹی لگائے ننگا تو بیٹھا ہی تھا۔ دھڑام سے دریا میں کود پڑا۔ جب کمبل کے پاس پہنچا تو وہ ریچھ نکلا۔ پاس آتے ہی اس نے چیلے جی کو دھر دبوچا۔ جب گروجی نے دیکھا کہ چیلا ڈبکیاں کھا رہا ہے اور کمبل اس کے بس میں نہیں آتا۔ تو آواز دی بچہ کمبل چھوڑ دے۔ چیلا چلایا، گروجی کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ وہ تو ریچھ ہے، اور چیلے جا کر اُسے بچا لائے۔

(۵۵) کچّی مچھلی پکی مچھلی (۵۵)

ایک صاحب تھوڑے بہت روپے والے تھے۔ مگر بے انتہا بدمزاج۔ جورو کرتے اس سے نہ بنتی۔ چار دن میں طلاق دیدیتے

ان کا پیغام لیکر کٹنی کسی گھر گئی۔ گھر والوں کو ان کا حال معلوم تھا۔ کانوں پر
ہاتھ دھرے۔ بیٹی دینے کو راضی نہیں ہوئے۔ بیٹی نے جو نسبت
کا حال سنا، چپکے سے اپنی اماں سے کہا۔ میرا یہاں نکاح کردو۔
میں اس مردوے کو ٹھیک کرلوں گی۔ ماں نے کٹنی سے بات
چیت کی اور ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ اس کے چند روز بعد میاں
نے بازار سے ایک مچھلی لاکر بیوی کو دی۔ اور کہا، ہم باہر جاتے ہیں۔
ہمارے واسطے پکا رکھنا۔ آکر کھائیں گے۔ بیوی نے مچھلی کو بنایا۔
دو کھنڈیوں کے کباب لگائے۔ دو شوربے دار پکائے۔ دو سوکھے
اور دو کچے ہی رکھے۔ اور ایک رکابی میں تھوڑی سی خاک بھر رکھی
یہ سب کچھ کوٹھری میں دھر آن بیٹھی۔ جب میاں گھر میں آئے، ان
کے آگے دسترخوان بچھایا۔ روٹی رکھی اور شوربے دار مچھلی لاکر
سامنے رکھدی۔ وہ بولے جو میں سوکھی کھاتا۔ دوڑ کر گئی اور سوکھی
لے آئی۔ پھر بولے جو میں کباب کھاتا۔ اس نے کباب لا حاضر
کئے۔ بولے اگر میں کچی کھاتا۔ وہ کچی بھی لے آئی۔ اب میاں زچ
ہوگئے۔ اور مزاج خراب ہوگیا۔ غصہ میں آکر بولے، جو میں خاک دھول

کھاتا۔ بیوی دوڑی گئی اور خاک دھول کی رکابی پیش کردی۔ اب یہ سمجھے کہ اس عورت سے سر برآ نہیں ہو سکتا کہنے لگا۔ میں ہارا اور تو جیتی۔ پھر یہ دونوں سلوک سے رہنے سہنے لگے۔

کبھی اوتے تھے کبھی جھولتے تھے کبھی گرتے تھے

(۵۶) سلوگٹھن (۵۶)

ایک ہوا ایسی چلی بیٹھے دانت گھسن

کسی شہر میں ایک بادشاہ تھا اور اس کی ایک لڑکی۔ جگہ جگہ سے لڑکی کے پیغام آتے۔ مگر وہ منظور نہیں کرتا اور کہتا، میری لڑکی کے واسطے جب عرش پر سے بر اترے گا تو بیاہوں گا۔ ایک دن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سخت آندھی آئی۔ چمار کا لونڈا اسٹرک پر بیٹھا جوتیاں گانٹھ رہا تھا۔ ہوا سے اڑ کر محل کی چھت پر جا پڑا۔ محل میں غل مچ گیا کہ چھت پر کیا آن پڑا ہے۔ جا کر دیکھا تو ننگا دھڑنگا۔ لنگوٹی باندھے

ایک جوان لونڈا پڑا ہے۔ بادشاہ کو اطلاع کی گئی۔ بادشاہ بولے۔ دیکھو عرش پر سے لڑکی کا دولھا اترا ہے۔ سارے محل میں خوشیاں ہوئیں۔ شادیانے شہر بھر میں بجائے گئے۔ اس کو چھت پر سے بہت عزت آبرو کے ساتھ اُتار کر لائے۔ دیکھا تو اس کے دانتوں پر زرد زرد میل کے لیو چڑھے ہوئے ہیں۔ بھلا چمار کب دانت مانجھتے ہیں۔ ان کے دانت تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ منجن حاضر کیا اور دانت صاف کرنے کو بٹھایا۔ اب یہ بیٹھا منجن مل رہا ہے۔ اور کہتا جاتا ہے "کبھی اودلتے تھے کبھی جھوتے تھے کبھی کرتے تھے سلو گٹھن۔ ایک ہوا ایسی چلی کہ بیٹھے دانت گھسن۔" پھر اس کو نہلا دھلا کر پوشاک پہنائی اور شاہزادی سے شادی کردی۔ مگر ڈر کے مارے اس کا دم بند تھا۔ تھوڑے دنوں میں حال کھل گیا۔ کہ یہ تو فلاں چمار کا لڑکا ہے جو آندھی میں اُڑ گیا تھا۔ ماں باپ نے آکر اس کو پہچان لیا۔ جوتیاں مار کے محل کے باہر نکال دیا گیا۔

(ک) # گڑ کی جوتی (۵۷)

ایک گاؤں تھا۔ اس میں گڑ ناپید تھا۔ ملتا بھی تھا تو بڑا مہنگا۔ کسی دن اس گاؤں میں سے ایک امیر کی سواری جا رہی تھی۔ سارا گاؤں سیر دیکھنے اکٹھا ہو گیا۔ ان میں ایک باپ بیٹے بھی تھے۔ امیر صاحب گھوڑے پر سوار تھے۔ پاؤں میں ٹاٹ باقی سلیم شاہی جوتی دلّی کی بنی ہوئی بہت نازک اور بھڑ کول تھی۔ گنوار کے بچّے نے جو یہ جوتی دیکھی اس کو بہت پسند آئی۔ بولا، باپو باپو ایسی جوتی تو میں بھی پہنوں گا۔ مجھے بھی لا دے۔ باوا نے کہا، اس کا کیا کہنا۔ یہ تو امیر ہے امیر چاہے گڑ کی جوتی پہنے۔ ہم ایسی جوتی کہاں سے لائیں

(۵۸) # گربہ کشتن روزِ اوّل (۵۸)

ایک صاحب بیوی بیاہ کر لائے۔ چاہا کہ بیوی پر پہلے ہی دن اپنا رعب بٹھا دیں۔ کہیں سے ایک بلّی پکڑ لائے اور چھپرکھٹ کے پائے سے باندھ دی۔ رات کو جب میاں بیوی چھپرکھٹ پر سوئے

تو بلّی میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ یہ اندر سے جھنجلا کر بولے، دیکھ غل نہ مچا۔ اگر اب کے بولی تو تجھے قتل کر ڈالوں گا۔ وہ بھلا جانور کیا ماننے والی تھی۔ وہ تو بیچاری بندھی پڑی تھی۔ پھر بولنے لگی۔ دوبارہ انھوں نے ڈانٹا اور کہا دیکھ دو دفعہ کہہ چکا ہوں، تو نہیں مانتی۔ اب تیری جان کی خیر نہیں۔ وہ پھر بولی۔ میاں پلنگ پر سے اُٹھے۔ کھونٹی پر تلوار لٹک رہی تھی اسے سونت بلّی کے دو کر ڈالے۔ دلہن سہم کر رہ گئی کہ یہ بڑا ظالم مردوا ہے۔ پھر عمر بھر اس کا رعب مانا کی

(۵۹) گرم تھوک ٹھنڈا تھوک (۵۹)

ایک نواب صاحب تھے اور ان کا ایک نوکر۔ یہ نواب صاحب سے بردل تھا۔ چاہتا تھا کسی طرح سے ان کی نوکری سے چھٹکارا ہو۔ مگر وہ اسے علیحدہ نہیں کرتے تھے۔ اس واسطے کہ بہت کاروان تھا۔ ایک دن کسی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب صاحب سر گھٹا رکھتے تھے۔ ٹوپی اتار کر گود میں رکھ لی اور نوکر سے کہا۔ ارے بھائی ادھر آ اور میرا سر سہلا۔ کھجلی ہو رہی ہے۔ نوکر پیچھے

آن کر کھڑا ہوا۔ اور لگدی کی لگدی تھوک کی ان کی چندیا پر تھوک کر چندیا سہلانے لگا۔ نواب صاحب کو نوکر کا جدا کرنا اس حرکت پر بھی منظور نہ تھا۔ بولے بھائی کیا اچھا گرم گرم تھوک ہے نوکر نے عرض کی حضور میرا تھوک تو گرم ہے۔ آپ ایسا نوکر رکھ لیجے جس کا تھوک ٹھنڈا ہو۔ یہ کہہ کر چلتا بنا۔

ل لڈو نوکڑ وے ہیں ۶۰

ایک اندھا فقیر کسی پیپل کے نیچے بیٹھ کر بھیک مانگا کرتا تھا۔ صبح سویرے آتا اور بڑی رات گئے جاتا۔ اس پیپل کی جڑ میں اس نے ایک کھو بنا رکھی تھی۔ جس میں اس کا سارا مال خزانہ رہتا تھا جب ساری سڑک پر سناٹا ہو جاتا اور کسی طرف سے آنے جانے والے کی آہٹ نہ سنائی دیتی تو اس کھو کو کھولتا اور سارے دن کی کمائی وہاں رکھ دیتا۔ پھر اس پر پتھر رکھ چلا جاتا۔ ایک دن کسی خدا کے بندے نے اُسے یہ کرتے دیکھ لیا۔ جب فقیر چلا گیا اس نے کھو میں سے سب کچھ نکال لیا اور چل دیا۔ دوسرے دن اندھے نے سویرے

اگر جو ٹٹولا تو ساری عمر کی کمائی غائب تھی۔ منہ سے کچھ نکال نہ سکتا تھا۔ ایسا نہ ہو لوگوں کو معلوم ہو جائے اور مجھکو مالدار سمجھکر بھیک دینی چھوڑ دیں۔ بیٹھا بیٹھا رو یا کیا۔ اتنے میں وہی حضرت جو مال چرا لے گئے تھے، ایک لڈوؤں کی ٹوکری ہاتھ میں لئے ہوئے نمودار ہوئے۔ اور دو لڈو اندھے کو دیکر کہا۔ لو بھائی لڈو کھاؤ ہم نے نیاز دلائی تھی۔ اندھا بیچارا لڈو کھاتا جاتا تھا اور یہ کہتا جاتا تھا ”میاں لڈو تو کچھ کڑوے ہیں۔“

(۶۱) لاڈ گھنیری چاؤ کرت ہم (۶۱)

ایک کھاتے پیتے گھر کی لڑکی تھی۔ دوسری ایک غریب بڑھیا تھی جس کا ایک لڑکا تھا۔ بڑھیا نے لڑکی کی طبیعت اپنے لڑکے کی طرف مائل پائی۔ دل میں کہا کیا اچھا ہو میرے بیٹے کی اس سے شادی ہو جائے۔ پھر ہم دونوں پیٹ بھر کر کھانے تو لگیں گے۔ لڑکی کو پرچانا شروع کیا اور اس کو اس پر راضی کر لیا کہ فلاں دن رات کے وقت گھر سے نکل کر فلاں پہاڑ کے غار میں جا بیٹھے

وہ بھی اپنے بیٹے کو وہاں لے آئے گی۔ بیٹے کو لے رات کو غار پر جا پہنچی۔ مگر وہ لڑکی کسی وجہ سے وہاں نہیں گئی۔ لڑکا غار میں داخل ہو گیا۔ وہاں ایک ریچھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کو چمٹ گیا اور بھیچنے لگا۔ لڑکا اندر سے بولا "ماں یہ تو مجھے بھیج بھیج کر مارے ڈالتی ہے۔ اماں نے کہا، بیٹا چپ چپ۔ لاڈ گھنیری چاؤ کرت ہے۔ جب اجالا ہوا، اور بڑھیا نے غار کے اندر جھانک کر دیکھا تو بیٹا مرا پڑا تھا۔ اور ایک ریچھ اس پر چڑھا بیٹھا تھا۔

(۶۲) لگی ڈبکی آئی سبکی (۶۲)

دہلی میں یہ دیکھا گیا ہے، جب گڈھ مکٹیسر پر گنگا نہان کا میلہ ہوتا ہے۔ اس کے ہوتے ہی سردی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ میلہ اکثر نومبر کے دوسرے یا تیسرے ہفتہ میں ہوا کرتا ہے۔ یہاں ہندو جا کر تین دن تک گنگا اشنان کرتے ہیں اور ہر نہان کو ایک ڈبکی کہتے ہیں اس بنا پر یہ مثل مشہور ہو گئی ہے۔ "کہ لگی ڈبکی اور آئی سبکی"

م ما یہ کے ہیں تین نام پرسا پرسو پرس رام (۶۳)

ایک بنئے کا لڑکا تھا۔ جب وہ ذرا ہوشیار ہوا تو باوا نے
اُسے آٹھ آنہ کے پیسے دے دیئے اور کہا، بیٹا چنے بیچ اور کما۔
یہ گرما گرم چنے بھڑبونجہ سے لے روز صبح گلی گلی آواز لگانے لگا۔
لوگ یہ کہہ کر بلاتے تھے اُو پرسا، چنے والے ادہی کے چنے
دیتا جا۔ کچھ دنوں میں اس نے چنے بیچ کر دو تین روپے جمع کر لئے
باوا نے کہا، بیٹا اب تو خوانچہ لگا لے۔ اب وہ بازار میں خوانچہ لئے
پڑا پھرتا اور آواز لگاتا۔ لوگ یہ کہکر بلاتے، آؤ بھائی پرسو دو پیسے
کا سودا دیتے جاؤ۔ اس میں بھی اُسے نفع ہوا۔ اور اتنا روپیہ ہو گیا
کہ بنئے کی دکان کھول بیٹھے۔ دکان لگالی۔ اب جو گاہک آتا ہے۔
کہتا ہے، لالہ پرس رام روپیہ کا آٹا دیدینا۔ اور دو کا گھی۔ کسی نے
ایک دن اس سے پوچھا، لالہ جی آپ کا نام۔ بولا بھائی پرسا پرسو
پرس رام۔ اس نے کہا یہ تین تین نام کیسے؟ بولا، میاں جب چنے
بیچتے تھے تو پرسا کہلاتے تھے۔ خوانچہ لگایا تو پرسو کہلائے۔ اب

دکان پر بیٹھے تو پرس رام ہیں۔ بھائی جی" نا یہ کے ہیں تین نام پرسا پرسو پرس رام۔"

(۶۴) مینخ دی مینچو نہیں دیا (۶۴)

ایک نواب صاحب تھے۔ اُنھوں نے اپنی لڑکی بڑے دھوم دھام سے بیاہی، اور جہیز میں جو جو چیزیں ممکن ہو سکتی تھیں۔ سب دیں۔ ڈیرے خیمے اور شامیانے تک بھی نہ چھوڑا۔ یہ سب چیزیں بھی ایسی ویسی نہیں بلکہ گنگا جمنی میخوں کے ساتھ۔ دولھا والوں کے ہاں کا فراش جب شامیانہ کھڑا کرنے اٹھا تو کہنے لگا" دیکھا بھائی، نواب صاحب نے دیا ہی کیا ہے۔ میخیں تو دیں مگر میچو ندارد اب میخیں کیا میں ان کے سر سے گاڑوں۔

(۶۵) میاں منّا کی گواہی (۶۵)

میاں منّا نام ایک سقّے تھے جو دہلی میں سبزی منڈی کی بڑی مسجد میں پانی بھرا کرتے تھے۔ اس مسجد کے ایک ملّاجی تھے

جنھوں نے سارے رائین بچوں کو قرآن شریف پڑھایا تھا۔ سب رائیں ان کی بہت عزّت کرتے۔ ایک دن اتفاق یہ ہوا کہ بچے پڑھا رہے تھے۔ ایک بچّے پر غصہ آگیا۔ اس کو ایک طمانچہ کھینچ مارا بری گھڑی کہہ کر نہیں آتی۔ بچّے کو طمانچہ کچھ ایسا بے تھوڑ لگا کہ وہ فوراً گر کر مر گیا۔ پولیس آن موجود ہوئی اور تفتیش شروع ہوگئی۔ رائین سب جانتے تھے کہ ملّا جی بڑے بھلے مانس ہیں۔ یہ شدنی تھا ہوگیا۔ بچے کے ماں باپ رو پیٹ کر ہو بیٹھے۔ اور ملّا جی سے کوئی تعارض نہیں کیا۔ اب پولیس قتل کی شہادت فراہم کرنی چاہتی ہے۔ مگر کوئی ملّا جی کے خلاف گواہی دینے پر راضی نہیں ہوتا اتنے میں میاں مَنّا آن کھڑے ہوتے۔ کہنے لگے میں گواہی دوں گا بڑا ستم ہوا ہے۔ انھوں نے بچّے کو مارا ہے۔ رائیوں نے لاکھ سمجھایا۔ اور لالچ دیا کہ میاں مَنّا یہ کیا کرتے ہو۔ ناحق ملّا جی کی جان جائے گی۔ مگر انھوں نے ایک نہ مانی۔ پولیس انھیں ساتھ لے گئی تھانے چلے گئے۔ ان کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ روز میاں مَنّا کو ملائی پراٹھے کھلائے جاتے۔ ملّا جی کا قتل میں چالان کردیا جب

میاں مُنّا حاکم کے سامنے گواہی دینے پیش ہوئے تو حاکم نے کہا تم نے طمانچہ مارتے دیکھا بولے صاحب بڑا ہی خوبصورت اور پیارا پیارا بچہ تھا۔ دیکھتے ہی پیار آتا تھا۔ ایک طمانچہ میں مرگیا۔ بس ملّاجی نے ایک ہی طمانچہ مارا۔ عدالت نے کہا کہ تم نے ملّاجی کو طمانچہ مارتے دیکھا۔ بولے حضور سب ہی کہتے ہیں کہ ہائے ہائے ایک طمانچہ میں کام تمام ہوگیا۔ بھائی تم نے دیکھا بھی۔ کہنے لگے دیکھا تو نہیں، ساری سبزی منڈی یہی کہتی ہے۔ کیا بھلا سب جھوٹ بولتے ہیں۔ لڑکا نہیں مرا۔ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ تم نے دیکھا یا نہیں کہنے لگے، صاحب کہتا تو ہوں۔ میں نے نہیں دیکھا میں اس وقت نہیں تھا۔ مگر ہاں سب کہتے ہیں کہ ملّاجی نے اس کو مار ڈالا۔ مجسٹریٹ نے حکم دیا۔ اس کو نکال دو یہ پاگل ہے۔ عینی شہادت نہیں ملی مقدمہ ملیا میٹ ہوگیا۔ پولیس کے پاس دوسرا گواہ ہی نہ تھا۔ میاں مُنّا اینٹھتے ہوئے باہر نکل آئے۔ ملّاجی رہا ہوگئے جو لوگ ملّاجی کے ساتھ عدالت گئے تھے ان سے میاں مُنّا کہنے لگے۔ بھائی دیکھا ہم نے کیا کام کیا۔ اگر تمھارے سمجھانے

بجھانے میں آجاتے تو کام بگڑ جاتا۔ پولیس کوئی نہ کوئی گواہ تو پیدا کرتی۔ وہ کچھ نہ کچھ جھوٹ سچ کہہ دیتا۔ اور ملا جی کی جان عذاب میں آجاتی۔ ہم نے ملائی پر انٹھے بھی چٹ کئے اور ملا جی کی جان بھی بچائی۔

(۶۶) مونچھیں نیچی کر لینی (۶۶)

قدیم زمانہ کا یہ دستور تھا کہ جو لوگ اپنے کو سپاہی منش خیال کرتے تھے، اس میں خواہ امیر ہوں خواہ غریب، ڈاڑھی مونچھیں چڑھی رکھتے تھے اور ہر وقت بازار و برزن میں روپ جی بنے پڑے پھرتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک دولتمند سوار گھوڑے پر سوار چلا جا رہا تھا۔ اس کے آگے آگے ایک اور شخص غریب مگر سپاہی منش پیادہ پا اپنے خیالات میں غرق چلا جا رہا تھا۔ جس وقت یہ گھوڑے سوار اس کے برابر سے ہو کر گزرا تو اس نے بلا ارادہ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیا یا یوں کہو کہ مونچھیں مروڑیں یہ اہل جنگ کا دستور تھا۔ جب دوسرا سپاہی سامنے آکر مونچھوں

پرتاؤ دے تو گویا وہ مبازرت طلب کرتا ہے یعنی لڑائی کا چیلنج
دیتا ہے۔ جب سوار صاحب نے یہ دیکھا۔ تو سمجھے کہ یہ ادنیٰ
سپاہی بچہ مجھ سے لڑنا چاہتا ہے۔ فوراً اس کو ٹوکا اور کہا، کیوں
بھائی مقابلہ پر آنا چاہتے ہو۔ آؤ۔ اب اس کو خیال آیا کہ آہ ہا یہ
صاحب گذر رہے تھے اور میں نے بے سوچے سمجھے مونچھیں
مڑوڑیں۔ کہنے لگا۔ اس میں ندامت ہی کیا ہے۔ میں بھی سپاہی بچہ
ہوں اور آپ بھی سپاہی بچہ۔ غریب امیر کا اس میں امتیاز نہیں۔
مقابلے کو حاضر ہوں۔ مگر آپ سوچ لیجئے کہ دنیا کیا کہے گی۔ آپ
گھوڑے پر سوار ہیں۔ میں پیادہ۔ آپ کے ہتیار مجھ سے کہیں افضل
ہیں۔ اگر میرا آپ کا مقابلہ ہو تو مناسب یہ ہے کہ میں بھی آپ ہی
کے سج دھج کا ہوں، پھر مقابلہ زیبا ہے۔ سوار صاحب کہنے لگے،
ہاں بھائی یہ تو سچ کہتا ہے۔ چل میرے ساتھ چل۔ میں تجھے اپنے
گھر میں مہمان رکھوں گا اور ہر طرح سے خدمت کروں گا۔ یہاں تک
کہ تو میرے مقابلہ کا ہو جائے۔ پھر ہم تم دونوں میدان میں اتر کر
داد سپہ گری دیں گے۔ دونوں گھر آ گئے۔ چند روز میں مہمان صاحب

کھا پی کر اور ریاض کر کے خوب موٹے تازے ہو گئے۔ اب صاحب خانہ نے ان سے کہا وقت آگیا ہے کہ تم مقابلہ کے واسطے تیار ہو جاؤ۔ دوسرے دن اپنے ہی جیسے ہتیاروں سے اس کو آراستہ کر کے اور اپنا ہی سا گھوڑا اس کو دیکر مبارزت کے واسطے میدان کی طرف روانہ ہوئے۔ خلق خدا اسیر دیکھنے کو جمع ہو گئی۔ جب میدان میں اترے اور ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہوئے تو سپاہی بچے نے پوچھا کہ آخر اس مقابلہ کی وجہ کیا ہے۔ فرمایا کیا تجھکو یاد نہیں۔ تونے فلاں دن ہم کو دیکھ کر مونچھوں پر تاؤ دیا تھا۔ کہنے لگا۔ بس اتنی ہی سی بات ہے۔ بہت اچھا حضور اگر اس دن میں نے مونچھوں کو تاؤ دیا تھا تو آج آپ کے روبرو مونچھیں نیچی کئے لیتا ہوں۔ یہ کہہ دونوں ہاتھ مونچھوں پر لے جا مونچھوں کو نیچا کر لیا اور گھوڑے کو ایڑ کر یہ جا وہ جا۔ سپاہی صاحب منہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور اس کی بزدلی پر لعنت ملامت کرتے ہوئے لاحول پڑھتے گھر آگئے

---

(۶۷) مردن موقوف مقبرہ را مسمار سازند (۶۷)

یہ مثل اس موقع پر بولی جاتی ہے جب کسی ناخوشگوار واقعہ کے پیش آنے کا اندیشہ ہوتا ہے اور اس کے لئے پیش بندی کی جاتی ہے۔ پھر اس کا خطرہ جاتا رہتا ہے اور دفیعہ کی تدبیریں ختم کردی جاتی ہیں۔

قصہ یہ ہے۔ ایک امیر کبیر کسی مرض مہلک میں مبتلا ہو گئے۔ اور ان کو یقین ہو گیا کہ وقت آگیا ہے۔ میر عمارت کو طلب کر کے اس کو حکم دیا کہ مقبرہ کی تعمیر شروع کردی جائے۔ مقبرہ زیر تعمیر تھا کہ مرض کا ازالہ ہو گیا اور وہ تندرست ہو گئے۔ پھر میر عمارت طلب ہوا اور ارشاد ہوا۔ مردن موقوف مقبرہ را مسمار سازند۔

(ن) نمازی کا ٹکا (۶۸)

ایک صاحب کچھ گدرائے ہوئے بدن کے تھے۔ ایک دن جامع مسجد میں حوض کے کنارے مغرب کے وقت نماز پڑھ رہے تھے خوب گرمی پڑ رہی تھی۔ مہین ململ کا کرتہ زیب تن تھا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ جن کے چوتڑ ذرا موٹے ہیں۔ تو مہین کپڑا چوتڑوں کے جوف میں گھس جاتا ہے۔ کوئی سادہ لوح ان کے پیچھے کھڑا تھا اس نے جو کرتہ اس طرح دیکھا آہستہ سے دامن پکڑ کر نکال دیا نمازی کو اس کی یہ حرکت ناگوار ہوئی۔ سلام پھیر کر مڑا اور اس کی طرف بری بری نگاہوں سے دیکھا اور ہوں ہوں کی۔ یہ دل میں سمجھا کہ کرتے کا دبا رہنا کوئی بڑے ثواب کی بات ہے۔ پھر انھوں نے نیت باندھ لی۔ اس نے کرتہ اسی طرح انگلی سے اندر کر دیا۔ نمازی صاحب کو غصہ تو بہت آیا مگر مسجد کے ادب کا لحاظ کرکے چپ ہو رہے۔ سلام پھیر جیب میں سے دو پیسے نکال اس کے ہاتھ پر دھر دئے۔ اب دل میں وہ یہ سمجھا کہ یہ کام بڑا اچھا ہے۔ لوگ

اس پر انعام دیتے ہیں۔ چند قدم پر کوئی اور شخص نماز میں مصروف
تھا۔ اس کا کرتہ بھی لمبا اور باریک تھا۔ اس نے پیچھے سے جا کر ان
کے چوتڑوں میں کرتہ گھسانا شروع کر دیا۔ یہ تھے تیز مزاج سلام پھیر
جوتا ہاتھ میں لے وہ جوتا وہ جوتا غریب کا پلیتھن نکال دیا۔

(۶۹) نفلوں ہی میں یاروں کا کام بن گیا (۶۹)

اس اجڑے دیار میں ایک استاد تھے جو فن سپاہ گری کے
کامل تھے۔ شہر میں سیکڑوں آدمی ان کے شاگرد تھے۔ استاد جی کو
شراب نوشی کی لت تھی۔ گردش زمانے سے ہاتھ تنگ ہو گیا۔ کچھ
دن شراب میسر نہ آئی۔ طبیعت نڈھال اور افسردہ رہنے لگی۔ شاگردوں
کو بھی اس کا علم ہو گیا۔ اور ملال ہوا۔ اتنے میں جمعہ آ گیا۔ ارادہ کیا کہ
مسجد میں چل کر اللہ میاں سے عرض کریں۔ نہا دھو کپڑے بدل جامع مسجد
میں آ موجود ہوئے۔ پہلے ہی سے آدمی بھرے ہوئے تھے دروازے
کے پاس کے دالان میں سڑک کی جانب جگہ ملی آتے ہی تحیۃ المسجد
کے دو نفل پڑھنے لگے۔ ایک شاگرد شراب کی دو بوتلیں ہاتھ میں

لئے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔ مگر اُستاد جی مسجد میں داخل ہو چکے تھے۔ سڑک کے دوسری طرف جا کھڑا ہوا۔ اُستاد جی کو نماز میں مشغول پا کر پکارنا شروع کیا۔ اُستاد جی لے آیا ہوں۔ آگئی ہے۔ اور دونوں بوتلیں ہاتھوں میں لے کر نچانی شروع کیں۔ استاد جی نے سلام پھیر کر جو یہ ماجرا دیکھا تو سیدھے باہر کو ہو لئے۔ لوگوں نے کہا اُستاد جی کہاں چلے ابھی نماز تو ہوئی نہیں فرمانے لگے یاروں کا تو نفلوں ہی میں کام بن گیا۔

(۷۰) نوکر نوکر کے آگے چاکر۔ چاکر کے آگے کوکر کوکر کے آگے پیش کار چار یار چار ون بیکار

ایک نواب صاحب تھے ان کو افیون کی عادت تھی۔ ایک دن رات کو مصاحبوں میں بیٹھے تھے۔ فرمانے لگے بھائی ایک میرے شوق کی چیز ہے۔ وہی مجھے ٹھیک سرے کی نہیں ملتی۔ مصاحب بولے حضور وہ کیا ہے۔ کہا بھائی میں افیون کھاتا ہوں

اس کے اوپر سے رات کو ایک پیسہ کا دودھ پی لیتا ہوں۔
نوکر کمبخت دودھ میں پانی ملا لاتے ہیں۔ مصاحبوں نے کہا۔ حضور
آپ بھی تو غضب کرتے ہیں۔ ایک تو آپ کے شوق کی چیز وہ
بھی معمولی نوکروں کے ہاتھ پڑے۔ آپ کو چاہیئے کہ اس کام کے
لئے خاص نوکر مقرر کریں۔ کہ وہ دودھ کا اہتمام کیا کرے۔ بولے
بھائی کہتے تو سچ ہو۔ داروغہ جی کل سے ایک نوکر اس کام کے
واسطے آجائے۔ داروغہ جی نے ہاتھ باندھ کر عرض کی حضور بجا ارشاد
ہوا۔ دوسرے دن نوکر آن موجود ہوا۔ اس نے دوسرے نوکروں
سے پوچھا۔ بھائی آخر معاملہ کیا ہے۔ بولے نواب صاحب کے
واسطے روز رات کو ایک پیسہ کا دودھ آتا ہے۔ ہم بھی آخر پیٹ
اور بال بچے رکھتے ہیں۔ پون پیسے کا دودھ لاتے ہیں، تھوڑا سا
پانی ملا کر دیدیتے ہیں۔ یہ بولا بھائی میں تمہارا پیٹ کاٹنے تو نہیں
آیا۔ میں بھی پیٹ رکھتا ہوں اور صرف اسی کام پر نوکر ہوا ہوں۔
اور کسی جگہ سے مجھے یافت نہیں ہونے کی۔ بس آج سے دمڑی
تم لے لیا کرو۔ دمڑی میں دھیلے کا دودھ آجایا کرے گا۔ باقی پانی۔

اب جو نواب صاحب نے دودھ پیا تو پہلے سے بھی برا تھا۔ مصاحبوں
سے شکایت کی۔ بولے حضور آپ بھی تو ستم کرتے ہیں۔ ایک تو
آپ کے شوق کی چیز اور اس پر صرف دو روپیہ ماہوار کا نوکر۔ جناب
داروغہ نوکر ہونا چاہیئے وہ دودھ کی نگرانی کرے گا۔ اور عمدہ سے
عمدہ دودھ حاضر کیا کرے گا۔ بولے بھائی ٹھیک بات ہے۔ داروغہ جی
ایک داروغہ آئے عرض کی حضور جو حکم۔ دوسرے دن داروغہ آن پہنچا سارا ماجرا
دریافت کیا۔ بولا بھائی تم سب پیٹ رکھتے ہو۔ میں تمہارا پیٹ کاٹنے
نہیں آیا۔ اور میری تنخواہ تم سب سے زیادہ ہے۔ پھر میرا حصہ بھی
بڑا ہونا چاہیئے۔ بس بھائی دھیلا تم سب بانٹ لیا کرو۔ دھیلا میں لے
لیا کروں گا۔ نوکر بولے دودھ کہاں سے آئے گا۔ کہا پھر ہماری
داروغائی ہی کس کام کی۔ اگر یوں ہی کام نہ چلا دیا۔ نوکر کی طرف دیکھکر
کہا۔ بھائی تم شام کو بازار چلے جایا کرو۔ اور کسی حلوائی سے ذرا سی
ملائی پتہ پر مانگ کرے آیا کرو۔ پھر سمجھ لیں گے۔ داروغہ جی نے
ملائی کا پتہ مٹھی میں دبا۔ نواب صاحب کی مجلس میں جا بیٹھے۔ نواب
صاحب جب پینک میں گئے پتہ پر سے ملائی لے ان کے ہونٹوں

پر لتھیڑ دی۔ اور خود دوزالو اپنی جگہ پر جا بیٹھے۔ جب نواب صاحب پینک سے بیدار ہوئے، فرمایا دودھ کہاں ہے۔ آج اب تک ہم نے دودھ نہیں پیا۔ داروغہ جی نے ہاتھ باندھ کر عرض کی، حضور نوش جان فرما چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو ملائی اب تک ہونٹوں پر لگی ہوئی ہے۔ ہونٹوں پر جو زبان پھیرتے ہیں۔ تو ڈھیر کا ڈھیر ملائی کا منھ میں چلا گیا۔ بہت خوش ہوئے۔ اور مصاحبوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے بھائی دیکھو اب دودھ کا انتظام ٹھیک ہو گیا۔

(۷۱) نفع میں دو جوتیاں (۷۱)

راجپوتانے کے ریگستان میں ایک ٹھاکر جی بستے تھے۔ ان کے گاؤں سے چند میل کے فاصلہ پر ایک قصبہ تھا۔ جہاں سال کے سال بہت بڑا پینٹھ یعنی بازار لگتا تھا۔ تمام آس پاس کے ٹھاکر اور زمیندار وہاں خرید و فروخت کے واسطے جمع ہوتے۔ طرح طرح کے مال کی دکانیں لگتیں پینٹھ کا دن آیا۔ ٹھاکر جی اُٹھے۔ نہاتے دھوئے۔ الوٹ سے پگڑی باندھی۔ سجیلے جوان بن سانڈھنی

پرسوار ہو۔ قصبہ کو روانہ ہوئے ۔ ارادہ کیا کہ بہت کچھ سامان لائیں گے
بہت سا روپیہ بھی ساتھ لیا۔ بازار میں ایک دکان جوتوں کی لگی دیکھی۔
ایک جوڑا ٹھاکرجی کو بہت پسند آیا۔ مگر بھاؤ نہ بنا۔ چھوڑ کر چل دیئے
پھر اُنھوں نے طرح طرح کی چیزیں خریدیں۔ اپنی سانڈھنی پر لاد چلنے
کی تیاری کرلی۔ چمار ٹھاکرجی کو جانتا تھا۔ اور یہ بھی اس کو معلوم تھا کہ
کس گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ ان کے روانہ ہونے سے
پہلے اپنی دکان بڑھا، ٹھاکرجی کا پسندیدہ جوڑا بغل میں دبا، اسی گاؤں
کے راستہ پر چل پڑا۔ آگے چل کر ایک پوائی راستہ پر ڈال دی اور
اس سے کچھ آگے ایک ٹیلی کے پاس برسرِ راہ دوسرا پیر رکھ دیا
خو ٹیلے کی آڑ میں چھپ بیٹھا۔ ٹھاکرجی جو چلے تو راستہ میں اپنی دلپسند
جوتی کا ایک پیر پڑا پایا۔ دل میں افسوس کیا کہ کسی غریب نے
خریدی ہوگی۔ راستہ میں ایک پیر نکل گیا۔ میں اس کو لیکر کیا کروں کہ
کس کام کا ہے۔ تھوڑا آگے بڑھے تھے کہ دوسرا پیر نظر آیا۔
اب ٹھاکرجی کی باچھیں کھل گئیں۔ لو جوتی مفت میں ہاتھ آئی۔ اونٹ
کو بٹھا اترپڑے اور دوسرے پیر کے واسطے پیادہ پا چلے کہ

دونوں کو سانڈھنی پر رکھ لیں گے۔ جب ٹیلے کی آڑ ہو گئی تو چمار سانڈھنی پر بیٹھ یہ جا وہ جا۔ ٹھاکر جی واپس آکر جو دیکھتے ہیں۔ سانڈھنی اور سب مال و متاع غائب۔ نفع میں دو جوتیاں رہ گئیں۔

(۷۲) نخرہ گھر میں آگیا (۷۲)

ایک میاں بیوی تھے۔ بیوی بہت خوبصورت تھی چندے آفتاب اور چندے مہتاب۔ مگر میاں کو عالم رنگ و بو کی سیر کا شوق تھا۔ اور کسی رانڈ کے عشق میں مبتلا تھے۔ روز رات کے ایک دو بجے گھر میں گھستے۔ بیوی رنجیدہ خاطر رہتی تھی۔ انھوں نے سوچا کہ اس رنڈی میں آخر کیا خوبی ہے جو میاں اس کی طرف التفات کرتے ہیں اور میری طرف رخ نہیں۔ ایک دن مردانہ بھیس کر میاں کے وہاں تشریف لانے سے پہلے جا موجود ہوئیں۔ تھوڑی دیر بعد میاں بھی آئے۔ دروازے میں قدم رکھنا تھا کہ اس بیسوا نے گالیوں کی بوچھاڑ کردی۔ میاں کان دبائے سیدھے چلے آئے اور منو بلائی کی طرح آن بیٹھے۔ بیوی نے ساری گفتگو یاد کر لی۔

اور دل میں سوچا کہ ہو نہ ہو یہی دریدہ دہنی ہے۔ جس پر میاں مرتے ہیں۔ وہاں سے اُٹھ گھر چلی آئی اور پلنگ پر لیٹ رہیں۔ جب میاں کی تشریف آوری کا وقت ہوا اور گھر کا دروازہ کھلا یہ سیدھی اُٹھ بیٹھیں۔ میاں کا صحن چبوترہ پر قدم رکھنا تھا کہ انھوں نے اسی گفتگو کا اعادہ شروع کر دیا جو رنڈی کے کوٹھے پر سنی تھی۔ میاں نے جو یہ گل افشانی سنی تو حیران رہ گئے۔ اور سمجھے کہ بیوی نے میرے حال کا مشاہدہ کر لیا ہے۔ بولے لو اب تو نخرہ گھر ہی میں آگیا کہیں جانے آنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کے بعد سے میاں بیوی سلوک سے رہنے سہنے لگے۔

(۷۴) وہی مرغی کی ایک ٹانگ

ایک صاحب بہادر تھے۔ ان کے پاس ایک خان ساماں نوکر تھا۔ حکم ہوا مرغی بھونی جائے۔ خان ساماں نے مسلم مرغی پکائی۔ اس کا ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ بچے نے ضد کی اور کہا ابا میں تو مرغی کی ٹانگ کھاؤں گا۔ مجبور ہو کر مرغی کی ایک ٹانگ کاٹ بچے کے

حوالہ کی۔ میز پر جب مرغی لگائی گئی تو ایک ٹانگ ندارد۔ صاحب نے دریافت کیا اس کی دوسری ٹانگ کیا ہوئی۔ خان ساماں بولا۔ حضور یہ مرغی ایک ہی ٹانگ کی تھی۔ صاحب بولا ٹول ہم نے تو ایک ٹانگ کا مرغی نہیں دیکھا۔ حضور میں ملاحظہ کرادوں گا۔ دوسرے دن صاحب بہادر کوٹھی کے کمپاونڈ میں ٹہل رہے تھے۔ سامنے ایک مرغا ٹانگ اُٹھائے کھڑا تھا۔ خان ساماں دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ حضور دیکھ لیجئے۔ اس مرغ کی بھی ایک ہی ٹانگ ہے۔ انھوں نے ایک کنکری زمین پر سے اُٹھا مرغ کو ماری۔ وہ دوسری ٹانگ ٹیک بھاگنے لگا۔ صاحب بولے۔ ول خان ساماں دیکھو اس کی تو دو ٹانگ ہے۔ خان ساماں نے جواب دیا۔ حضور اگر آپ میز پر بھی اسے کنکری مارتے تو وہ دوسری ٹانگ ٹیک دیتا۔ صاحب بہادر ہنس پڑے اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

---

(۷۴) ہاتھی ہے یا امرود (۵)

ایک گنوار تھا۔ وہ کسی ضرورت سے دہلی آیا۔ دہلی میں اس نے دو چیزیں ایسی دیکھیں جو پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ ایک تو ہاتھی دوسرا امرود۔ نام پوچھکر اچھی طرح یاد کرلیا اور ایک نوٹ بک میں لکھکر پاس رکھ لیا۔ جب گاؤں میں واپس گیا تو بڑا عقلمند سمجھا جانے لگا۔ اس لئے کہ دہلی دیکھ آیا ہے۔ اتفاق سے کچھ عرصہ بعد اس گاؤں میں ایک ہاتھی آنکلا۔ گاؤں والوں نے ہاتھی کبھی دیکھا نہ تھا۔ بہت حیران ہوئے کہ یہ کیا جانور ہے۔ دوڑے دوڑے ان کے پاس گئے۔ چلو بتاؤ یہ کیا نیا جانور آیا ہے۔ وہ وہاں گیا اور اسے دیکھکر لپکا ہوا گھر واپس آیا اور نوٹ بک ہاتھ میں لے پھر جا پہنچا اس میں سے پڑھکر کہا۔ بھائی یا تو یہ ہاتھی ہے یا امرود۔ یہی دونوں چیزیں ہم نے دہلی میں نئی دیکھی تھیں۔ پھر اس سے دریافت کیا بھائی اس کا منہ کدھر ہے اور دم کدھر۔ یہ چاروں طرف ہاتھی کے پھرا اور بہت غور کی۔ دیکھا کہ ایک طرف چھوٹی دم ہے اور دوسری

طرف بڑی ساری (سونڈ) بہت پریشان ہوا کہ دم کس کو بتایئے اور منہ کس کو۔ سو نچا ئے دم ضرور بڑی ہونی چاہیئے۔ دم کی طرف جا کر کہنے لگا یہ تو یقینی منہ ہے اور دوسری دم۔

ہیجڑے کا اللہ میاں نے اٹھنی کا بھی اعتبار نہیں کیا

۷۵

ایک ہیجڑا قطب صاحب چلا جا رہا تھا۔ راستے بھر دعا کرتا جاتا تھا کہ اللہ میاں اگر ہیجڑے کو ایک روپیہ پڑا مل جائے تو آٹھ آنے تیرے نام پر دوں گا۔ خدا کی شان دیکھو جب قطب قریب رہ گیا۔ تو زمین پر سے ایک روپیہ پڑا پایا۔ مگر یہ روپیہ ڈیک کا تھا۔ جو اس زمانے میں آٹھ آنے کو چلتا تھا۔ بولا اللہ میاں آپ بھی خوب ہیں پہلے ہی سے اٹھنی کاٹ لی۔ ہیجڑے کا اتنا بھی اعتبار نہیں کیا

(۷۶) یہ تو چڑھاؤ پر بہتی ہے (ی)

ایک میاں بیوی تھے۔ مگر بیوی ایسی اوندھی عقل کی کہ میاں جو کچھ کہتا تھا اس کے خلاف کرنا اس کی عادت میں داخل تھا۔ میاں اس کے

ہاتھوں عاجز آگیا۔ یہ ندی پار کی بیٹی تھی۔ ایکدن ندی میں خوب چڑھاؤ آرہا تھا۔
میاں نے گھر میں آکر بیوی سے کہا میکے جانے کا ارادہ نہ کرنا۔ ندی میں چڑھاؤ آرہا
ہے۔ اس کو میاں کے کہنے کی مخالفت کرنی ضرور تھی۔ بولی میں تو ابھی جاؤں گی
تجھے پہنچانا ہوگا۔ میاں نے کہا اچھا بیوی چلو مگر ڈوب جاؤ گی۔ بولی ڈبوں یا
تروں میں تو اسی دم جاؤں گی۔ میاں لیکر چلے۔ جب ندی میں اترے تو بیوی
کو اپنے کندھوں پر بٹھالیا اور دونوں ٹانگیں ہاتھوں سے پکڑلیں۔ جب دھارے
پر پہنچے تو ٹانگیں ہاتھ سے چھوڑ دیں۔ بیوی لگی بہنے۔ کنارے پر جو لوگ کھڑے
تھے۔ انھوں نے چیخا ارے پکڑ ارے پکڑ۔ وہ چڑھاؤ کی طرف اُسے پکڑنے کو چلا۔
لوگ بولے ارے چڑھاؤ پر کیا دیکھتا ہے۔ بہاؤ پر دیکھ۔ کہنے لگا یہ اوندھی
تھی یہ تو چڑھاؤ ہی پر بہے گی۔

(۷۷) یا بار خدایا اک بام دو ہولیا (۷۷)

ایک گھر میں ماں بیٹے۔ بہو۔ بیٹی اور داماد رہا کرتے تھے۔ بڑی بی ایک
چھت پر سوتیں۔ بیٹی داماد دوسری چھت پر اور بہو بیٹے تیسری پر۔ ان کا نیچے
جانے کا راستہ تینوں چھتوں پر سے ہو کر گزرتا تھا۔ بڑی بی علی الصباح بیدار ہوئیں